نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی
ماہنامہ
رفیقِ منزل
ISSN 2456-0375
مارچ ۲۰۲۰
حیاتیاتی نظریہ ارتقاء
ایک راز ھے کورونا وائیرس
rafeeqemanzil.com
rafeeqemanzil
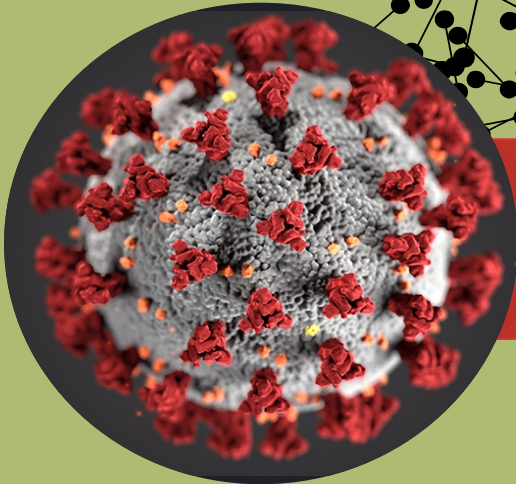
نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

ماہنامہ
جلد: ۳۳ شمارہ: ۳ مارچ ۲۰۲۰ء رجب/شعبان ۱۴۴۱ھ

editor@rafeeqemanzil.com





**₹15** | سالانہ **₹160**

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Ph: 8447622919 | Email: officermgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic Organisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor : Saud Firoz Ahmed**

# دین کی کوشش اور نصرت وحمایت

مولانا محمد منظور نعمانیؒ

ایمان والوں سے اللہ کا خاص مطالبہ اور بڑا تاکیدی حکم ایک یہ بھی ہے کہ جس سچے دین کو اور اللہ کی بندگی والے جس اچھے طریقے کو انھوں نے سچا اور اچھا سمجھ کر اختیار کیا ہے، وہ اس کو زندہ اور سرسبز رکھنے کے لیے اور اس کو زیادہ سے زیادہ رواج دینے کے لیے جو کوشش کر سکتے ہوں ضرور کریں۔ دین کی خاص زبان میں اس کا نام جہاد ہے۔ اور مختلف قسم کے حالات میں اس کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔

مثلاً اگر کسی وقت حالات ایسے ہوں کہ خود اپنا اور اپنے گھر والوں کا اور اپنی قوم اور جماعت کا دین پر قائم رہنا مشکل ہو اور اس کی وجہ سے خدانخواستہ مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہوں، تو ایسے حالات میں خود اپنے کو اور اپنے گھر والوں اور اپنی قوم والوں کو دین پر ثابت قدم رکھنے کی کوشش کرنا اور مضبوطی سے دین پر جمے رہنا بہت بڑا جہاد ہے۔ اسی طرح اگر کسی وقت مسلمان کہلانے والی قوم جہالت اور غفلت کی وجہ سے اپنے دین سے دور ہوتی جارہی ہو تو اس کی اصلاح اور دینی تربیت کی کوشش کرنا اور اس میں اپنے جان و مال کا کھپانا بھی جہاد کی ایک قسم ہے۔

اسی طرح اللہ کے جو بندے اللہ کے سچے دین سے اور اس کے نازل کیے ہوئے احکام سے بے خبر ہیں، ان کو معقولیت اور سچی ہمدردی کے ساتھ دین کا پیغام پہنچانے اور اللہ کے احکام سے واقف کرنے میں دوڑ دھوپ کرنا بھی جہاد کی ایک صورت ہے۔

اور اگر کوئی ایسا وقت ہو کہ اللہ و رسول پر ایمان رکھنے والی جماعت کے ہاتھ میں اجتماعی قوت اور طاقت ہو، اور اللہ کے دین کی حفاظت اور نصرت کے مقصد کا تقاضا یہی ہو کہ اس کے لیے اجتماعی طاقت استعمال کی جائے تو اس وقت اللہ کے مقرر کیے ہوئے قوانین کے مطابق دین کی حفاظت اور نصرت کے لیے طاقت کا استعمال کرنا جہاد ہے۔ لیکن اس کے جہاد اور عبادت ہونے کی دو خاص شرطیں ہیں:

ایک یہ کہ ان کا یہ اقدام کسی ذاتی یا قومی مفاد کی غرض سے یا ذاتی یا قومی تعصب و دشمنی کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اصل مقصد صرف اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کے دین کی خدمت ہو۔

دوسرے یہ کہ اس کے قوانین کی پوری پابندی ہو۔ ان دو شرطوں کے بغیر اگر طاقت کا استعمال ہوگا تو دین کی نظر میں وہ جہاد نہیں، فساد ہوگا۔

بحوالہ
(اسلام کیا ہے)

# جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا

ابنِ آدم کے سامنے قرآن ایک سادہ سا سوال غور وفکر کے لیے پیش کرتا ہے کہ ''کیا جاننے والے نہ جاننے والوں کے برابر ہوسکتے ہیں؟''

یہ سوال قاری کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ طلبِ علم کی جستجو میں لگ جائے کیونکہ اس کے بغیر وہ ایک ''ترقی یافتہ حیوان'' تو ہوسکتا ہے لیکن ''انسان'' نہیں بن سکتا۔ اسی لیے خالقِ کائنات اپنی صفت الرحمٰن کا تعارف اس طرح کراتا ہے کہ ''الرحمٰن o علم القرآن o خلق الانسان o'' (رحمان نے قرآن سکھایا اس نے انسان کی تخلیق کی۔) اس بیان کی ترتیب سے یہ عقدہ حل ہوگیا کہ انسانیت کے درجے پر فائز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خود اپنے آپ کو اور اس کائنات کو پہچانے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات کو پرکھ کر اور مختلف تجربات کے ذریعے مادی ترقی تو کرسکتا ہے لیکن اپنے آپ سے اور اپنے مقصدِ حیات سے واقفیت بہم نہیں پہنچا سکتا۔ اس مقصد کے لیے اسے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی تعلیمات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

سمجھا نہیں کسی نے یہ مومن کے ماسوا
آئے کہاں سے اور کہاں جارہے ہیں لوگ

اگر کسی مسافر کو اپنی منزل کا پتا نہ ہو اور اپنے مسافر ہونے کا احساس بھی نہ ہو تو در بدر کی ٹھوکریں ہی اس کا مقدر ہوتی ہیں اور وہ ہر نئی ٹھوکر کی ایک تاویل کر بیٹھتا ہے۔

کائنات کی ابتداء اور اس کا انجام انسان کی پیدائش اور اس کا مقصدِ زندگی اور روح کی حقیقت یہ ایسے سوالات ہیں جن کے درست جوابات کسی بھی خدا بیزار فلسفہ یا مغربی سائنس کے پاس نہیں ہیں۔ جب انسان اپنی اصل سے واقفیت حاصل کرلیتا ہے اور ربِّ کائنات پر ایمان لے آتا ہے تو ان سوالات کا اُسے اپنے آپ ہی جواب مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صالح مومن سائنس کے ذریعہ زمین میں اصلاح کا کام کرتا ہے اور اہلِ ایمان کی جماعت خیرِ امت کا خطاب پاتی ہے۔ اس کے برعکس ایک خدا بیزار سائنس داں کی کاوشوں کے نتیجے میں فلاح اور بگاڑ دونوں ہی ممکن ہیں۔ اپنی دانست میں وہ اپنے ہر عمل کی مناسب توجیہ تو کرسکتا ہے مگر اصلاً ابن الوقتی اس کا شیوہ ہوتی ہے۔

خدا سے بے نیاز محققین جو خیالات قائم کرتے ہیں، ان کے برعکس کائنات کا مطالعہ اہلِ ایمان کو یہ اہم نکتہ سمجھاتا ہے کہ اس نظام کا ہر ذرہ اپنے رب کا حکم مان رہا ہے کیونکہ اس کے بنا وہ ایک لمحہ بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ:

''اورسورج اپنے خاص مدار پر حرکت کرتا ہے یہ خدائے عزیز وعلیم کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے اور چاند، تو ہم نے اس کے لیے منزلیں ٹھہرادی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کو یہ اختیار ہے کہ وہ چاند کو جالے اور نہ رات ہی دن سے پہلے نمودار ہوسکتی ہے، ہر ایک، ایک خاص مدار میں تیر رہا ہے۔'' (یٰسین، ۳۸-۴۰)

اس آیت کے ذیل میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ رقمطراز ہیں:

''کائنات کی تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود کی پوری نگرانی کرتی ہیں اور کسی حال میں بھی ان سے تجاوز کی جرأت نہیں کرتیں۔ یہ ان کا تقویٰ ہے، جس کا وہ اپنے عملی نمونے سے انسان کو درس دیتی ہیں کہ وہ اپنے ارادہ واختیار کی دنیا میں انہیں کی طرح خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کا پابند رہے اور اس سے تجاوز کر کے اپنے آپ کو برباد نہ کرے۔'' (حقیقت تقویٰ، ص ۱۴)

قرآن حکیم کی رو سے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان حدودِ الٰہی سے آشنا ہوجائے اور اپنے آپ کو اس فطرت پر قائم کرلے جس پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ جو خوش قسمت اللہ کے نور سے علم حاصل کرتے ہیں تو ان کے قلوب بھی منور ہوجاتے ہیں اور ان کا ظاہر بھی حق کا گواہ بن جاتا ہے۔ ''**انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء**''۔ ''اللہ سے ڈرتے تو اس کے وہی بندے ہیں جنہیں اس کی معرفت حاصل ہے۔'' (الفاطر: ۲۸)

ایمان ویقین کی دولت پانے کے بعد ایک انسان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ سماج میں عدل وقسط کے قیام کی کوشش کرے نیز پہلے سے قائم اداروں کی اصلاح کرے۔ **ان اللّٰہ یامر بالعدل و الاحسان**۔ 'اللہ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا۔'' (النحل) عدل کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہر ایک کو اس کا حق دیا جائے۔ کسی مظلوم کے خلاف اگر کہیں کوئی جابر ظلم کررہا ہو تو آواز اٹھائی جائے۔ معاشرہ کا وہ طبقہ جو اپنے حقوق سے محروم ہے اسے اس کا حق دلوایا جائے۔ ساتھ ہی ظالم وجابر کو خدا کا خوف دلایا جائے۔ احسان کا رویہ خشیتِ الٰہی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ شیخ سعدیؒ کے بقول ثمر آور شجر کی پہچان یہ ہے کہ وہ زمین کی طرف جھک جاتا ہے۔ اسی طرح ایک عالم معرفتِ الٰہی کے نتیجے میں اپنے آپ کو خلقِ خدا کے لیے وقف کردیتا ہے۔ اس کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ

**میں دوسروں کے لیے بے قرار پھرتا ہوں**
**عجیب درد مجھے میرے چارہ گر سے ملا**

یہ درد اس لیے پنپتا ہے کہ علم کے نتیجے میں بندۂ مومن جانتا ہے کہ دنیا کا ہر انسان کو اس کا بھائی ہے چنانچہ اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف تصور کرتا ہے اور یہ حقیقت جان لیتا ہے کہ اللہ کے بندوں کے ساتھ صلۂ رحمی، غم گساری کے نتیجے میں اس دنیا میں سکونِ قلب میسر آتا ہے اور انسان کا دل شکر کے جذبے سے معمور ہوجاتا ہے۔

علمی مجاہدہ کے نتیجے میں ایک طالب علم اس نکتے کو سمجھ لیتا ہے کہ ''نیکی اور بدی یکساں نہیں ہوسکتیں'' اور ''اندھے اور بینا برابر نہیں ہوسکتے۔'' اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد وہ گردوپیش میں ہونے والے ہر واقعے کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ہر خوشگوار صورتحال پر اللہ کی حمد وثنا کرتا ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ شخصیت حسنِ کردار سے آراستہ ہوجائے اور باطنی حسن کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کی بندگی کے لیے آمادہ کرلے۔

محمد معاذ

# حیاتیاتی نظریۂ ارتقاء تعارف وجائزہ

ڈاکٹر محمد رفعت
(پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

علم حیاتیات (Biology) کے تصورات میں نظریہ ارتقاء بہت مشہور ہے۔ اس نظریے کی کئی تعبیریں ممکن ہیں۔ مختلف تعبیروں کے تاریخی پس منظر کو سامنے رکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یونانی فلسفی ارسطو کے دور سے ہی بہت سے مفکرین یہ نظریہ کسی نہ کسی صورت میں پیش کرتے آئے ہیں۔ اس کی موجودہ شکل وہ ہے جو ڈارون نے پیش کی اور بیسویں صدی میں اس میں اہم اضافے ہوئے۔ ہم جانتے ہیں کہ یوروپ کی نشاۃِ ثانیہ کے ساتھ سولہویں صدی میں وہاں سائنس کا احیاء شروع ہوا تو علمِ حیاتیات میں بھی نئی تحقیقات سامنے آئیں۔ یوروپ کی اس وقت کی فضا میں جو رجحانات عام تھے ان سے متاثر ہوکر انگریز ماہرِ حیاتیات چارلس ڈارون (1809-1882) نے اپنا نظریۂ ارتقاء پیش کیا، جو سابق کے محققین کے خیالات سے مختلف تھا۔ ڈارون کا نظریہ اس کی مشہور تصنیف 'انواع کی ابتدا' (Origin of Species) میں سامنے آیا۔ یہ کتاب (1859) میں شائع ہوئی۔ اپنے عام فہم اندازِ بیان کی بنا پر اس کو وسیع حلقے میں پڑھا گیا اور انیسویں صدی کے اختتام تک عموماً مغربی علمائے حیاتیات اس نظریے کو قبول کر چکے تھے۔

## انواع کا ظہور

آج کے انسان کو جو معلومات حاصل ہیں، ان کی روشنی میں اہم واقعات غالباً ذیل کی ترتیب کے مطابق پیش آئے ہیں:

(الف) 14 ارب سال قبل، کائنات کی ابتداء ایک انفجارِ عظیم (Big Bang) سے ہوئی۔ اس وقت سے اب تک کائنات برابر پھیلتی جا رہی ہے۔

(ب) زمین 5 ارب سال قبل وجود میں آئی۔ مقبول خیال یہ ہے کہ سورج سے سیارے الگ ہوئے۔ ان میں زمین بھی تھی۔ زمین، دیگر سیاروں اور سورج کا یہ نظام، نظامِ شمسی کہلاتا ہے۔

(ج) ابتداء میں زمین گرم تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ٹھنڈی ہوتی گئی، یہاں تک کہ آج سے 4 ارب سال قبل زمین پر زندگی کا ظہور ہوا۔

(د) ابتداء میں زندہ اجسام بہت سادہ، یعنی ایک خلیے (Cell) کے تھے۔ ایک خلیہ کے سائز سے چھوٹے وجود کو ہم 'زندہ' نہیں کہہ سکتے۔ بہ الفاظ دیگر خلیے کے باہم ممتاز اجزاء تو ضرور ہوتے ہیں، لیکن وہ خلیے سے الگ کیے جا سکیں تو زندہ نہیں رہیں گے۔

(ہ) ایک خلیے کے بجائے چند خلیوں پر مشتمل زندہ مخلوقات 60 کروڑ سال قبل وجود میں آئیں۔

(و) نسبتاً زیادہ پیچیدہ جانوروں اور نباتات کا ظہور تقریباً ایک ہی زمانے میں ہوا، یعنی آج سے نصف ارب سال قبل۔

(ز) انسان دو لاکھ سال قبل وجود میں آیا۔

مندرجہ بالا معلومات آج کی تحقیقات کے مطابق ہیں۔ ان سے جو تاریخی ترتیب سامنے آتی ہے اس میں سادہ نظامِ جسمانی رکھنے والی زندہ مخلوقات (جو ایک خلیے یا چند خلیوں پر مشتمل تھیں) پہلے ظاہر ہوئیں اور پیچیدہ تر مخلوقات بعد میں وجود میں آئیں۔ ان

سب کے بعد انسان کا ظہور ہوا۔ کوئی اور زندہ نوع ایسی نہیں ہے جو انسان کے ظہور کے بعد کرۂ ارض پر نمودار ہوئی ہو۔

## ڈارون کا نظریۂ ارتقاء

ڈارون کے نظریہ ارتقاء میں جس بنیادی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی وہ یہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں زندہ انواع (Species)، جو زمین پر موجود ہیں، کیسے وجود میں آئیں؟ ایک اندازے کے مطابق کرۂ ارض پر اسّی لاکھ مختلف انواع موجود ہیں، جن میں پانچ فی صد نباتات اور بقیہ جانور ہیں۔ (اس تعداد میں ایک سیل والے جان دار مثلاً بیکٹر یا شامل نہیں ہیں)۔ یہ تعداد بہت بڑی ہے اور انواع کے بارے میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں، اس میں ان کے ابتدائی ظہور سے متعلق سوال یقیناً ایک فطری سوال ہے۔

اس سوال کا ڈارون کے نزدیک جواب یہ ہے کہ ”ساری زندہ انواع ایک یا چند ابتدائی انواع سے فطری انتخاب کے ذریعے وجود میں آئیں۔ کسی بھی نوع کے افراد کا جائزہ لیں تو وہ سب اپنی خصوصیات میں یکساں نہیں ہوتے۔ ایک نوع کے جن افراد کے اندر ایسی خصوصیات ہوتی ہیں، جو ان کو اطراف میں موجود طبعی ماحول (Environment) میں زندہ رہنے کا اہل بناتی ہیں، وہی باقی رہتے ہیں (باقی افراد ختم ہوجاتے ہیں)۔ طبعی ماحول میں بقا کی زیادہ صلاحیت کے حامل یہ افراد اپنی خصوصیات اپنی اگلی نسل کو منتقل کرتے ہیں۔ اس طرح (ماحول کے سیاق میں) اہل تر افراد کی تعداد متعلقہ نوع کی آبادی کے اندر بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ان سے مختلف خصوصیات رکھنے والے باقی نہیں رہتے۔ یہ 'فطری انتخاب' (Natural Selection) ہے، جو فطرت — طبعی ماحول کے عوامل کے ذریعے — خود کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ فطری انتخاب کا یہ عمل ابتدائی نوع سے مختلف نوع ظہور میں لے آتا ہے۔“ یہی ڈارون کا نظریہ ارتقاء ہے۔

ڈارون کی کتاب کا تذکرہ ہوچکا ہے۔ اس کتاب کے آخری باب کا آخری جملہ یہ ہے:

"There is grandeur in this view of life, with its several powers, having been orignially breathed into a few forms or into one; and that; whilst this planet has gone cycling on according to the fixed law of gravity, from so simple a beginning endless forms most beautiful and most wonderful have been, and are being evolved."

”زندگی کے ارتقاء سے متعلق جو تصور درج بالا سطور میں پیش کیا گیا ہے وہ ایک عظیم الشان تصور ہے، یعنی یہ کہ زندگی ابتدا میں ایک یا چند انواع میں پھونکی گئی، اس کے بعد جب کہ ایک جانب کرۂ ارض، سورج کے گرد، کشش ثقل کے متعین قانون کے تحت مستقل گردش میں تھا، وہیں دوسری جانب اس کرہ پر زندگی کا ارتقاء ہورہا تھا۔ انتہائی سادہ آغاز کے باوجود، ارتقاء کے عمل کے نتیجے میں زمین پر بے شمار جاذبِ نظر اور حیرت زدہ کردینے والی پیچیدہ انواع وجود میں آگئیں اور ارتقاء کا یہ عمل جاری رہا۔“

(انواع کی ابتدا، ڈارون، 1859 ایڈیشن)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابتدائی ایک یا چند انواع کے اندر زندگی پھونکنے کا کام کس نے کیا؟ ڈارون کی کتاب کے پہلے ایڈیشن (1859) میں اس کی تصریح نہیں ملتی (جیسا کہ درج بالا اقتباس سے ظاہر ہے) البتہ جب کتاب کا اگلا ایڈیشن (1860) میں شائع ہوا تو ڈارون نے by the creator کے الفاظ اس اقتباس میں بڑھا

دیے، گویا ابتدائی انواع میں زندگی پھونکنے کا کام، خالقِ کائنات نے کیا۔ اس اہم اضافے کا تذکرہ برٹ تھامسن (Bert Thomson) نے اپنے تحقیقی مضمون میں کیا ہے، جو 2003 میں اپولوجیٹکس پریس (امریکہ) سے شائع ہوا۔ البتہ برٹ تھامسن کا خیال یہ ہے کہ ڈارون نے یہ اضافہ مجبوراً کیا تھا، اس لیے کہ وہ انگلینڈ کے مذہب پسند عناصر کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اور یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس کا نظریہ ارتقاء، الحاد پر مبنی نہیں ہے۔

## ڈارون کے خیالات کا منبع

سولہویں صدی میں یوروپ کے سائنسی انقلاب یا نشاۃِ ثانیہ کے نتیجے میں جو ذہنی وفکری فضا یوروپ میں پروان چڑھ رہی تھی، اس میں مذہب بیزاری کا رجحان بتدریج بڑھتا جارہا تھا۔ ڈارون کا تعلق انیسویں صدی سے ہے۔ اس وقت تک سائنسی تحقیق کرنے والوں میں مذہب کو رد کرنے کا رجحان خاصا طاقت ور ہو چکا تھا۔ ڈارون کو اس فضا نے متاثر کیا۔ اس کے نظریے میں اس امر کی کوشش صاف نظر آتی ہے کہ حکیم وعلیم خالقِ کائنات کی تدبیر کے رول (کردار) کو تسلیم کیے بغیر زندگی اور اس کے ارتقاء کی توجیہ دریافت کی جائے۔

ڈارون پر اس دور کے ایک اہم مفکر مالتھوس (1766-1834) کے خیالات کا بھی اثر پڑا۔ مالتھوس نے انسانی آبادی کے اضافے پر اپنی تحریر 1798 میں شائع کی۔ (گویا ڈارون کی پیدائش سے دس سال قبل)۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ حالات ساز گار ہوں تو انسانی آبادی، کسی بھی خطۂ زمین میں تیزی سے بڑھتی ہے۔ ایک مختصر مدت میں دگنی، پھر اتنی ہی مدت میں چار گنی، پھر آٹھ گنی، ہوتی چلی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بڑھتی ہوئی آبادی کو غذا اور دیگر وسائلِ حیات درکار ہوتے ہیں۔ دوسری جانب غذائی پیداوار بڑھتی تو ضرور ہے، مگر اس کے بڑھنے کی رفتار کم ہوتی ہے۔ بہ طور مثال ایک متعین مدت میں غلے کی پیداوار ایک ٹن سے بڑھ کر دو ٹن، پھر اتنی ہی مدت میں تین ٹن، چار ٹن وغیرہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ آبادی اور غذا میں اضافے کی یہ دو شرحیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ آبادی میں اضافہ تو ۱، ۲، ۴، ۸، ۱۶ وغیرہ کی ترتیب کے مطابق ہوتا ہے، لیکن غذا کی پیداوار محض ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ کے اعتبار سے بڑھتی ہے۔ اس فرق کا بین نتیجہ یہ ہے کہ غذا بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورت پوری نہیں کرسکتی۔ چنانچہ اس آبادی کے افراد میں باہم کش مکش (Competition) کا آغاز ہوتا ہے اور اس کش مکش میں جو زیادہ قوی اور باصلاحیت ہوتے ہیں، وہی باقی رہ پاتے ہیں۔ باقی مٹ جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ڈارون نے مالتھوس کے خیالات کا اثر قبول کر کے جان داروں کی وسیع تر دنیا کے لیے بھی یہی تصویر پیش کی، یعنی یہاں بھی وسائل کم ہیں اور ہر نوع کی آبادی میں اضافے کی شرح خاصی ہے۔ چنانچہ وسائلِ حیات کے حصول کے لیے جان داروں کے مابین کش مکش ہوتی ہے (ایک نوع کے افراد میں بھی اور مختلف انواع کے درمیان بھی)۔ اس مسابقت میں جو جان دار ماحول سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، وہ گویا بقا کے لیے اپنی اہلیت ثابت کرتا ہے، چنانچہ وہ زندہ رہتا ہے۔ اس خیال کو Survival of the Fittest (بقائے اصلح) کا نام دیا گیا ہے۔ اس خیال کے مطابق Fittest (ماحول کے اعتبار سے مناسب ترین) جان داروں کا انتخاب، نظامِ فطرت خود کرلیتا ہے، چنانچہ اس کو فطری انتخاب (Natural Selection) کہا گیا۔

ڈارون یوروپ کے سرمایہ دارانہ نظام سے بھی متاثر ہوا۔ سرمایہ داری کے تصورات میں ایک اہم تصور آزادی کا ہے، یعنی معاشی تگ و دو کرنے والوں، خصوصاً بازار میں اپنا مال لانے والوں کے درمیان آزاد مقابلہ (Free Competition) سرمایہ داری کے حامیوں کے نزدیک، فطرت کا تقاضا ہے۔ اس مقابلے میں حصہ لینے والوں کو اپنی دوڑ دھوپ کے لیے آزاد ہونا چاہیے اور نظامِ سرمایہ داری

میں اس امر کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے کہ ان کی آزادی پر حکومت کوئی قدغن نہ لگائے۔ ڈارون کا خیال ہے کہ جس طرح سرمایہ دارانہ مسابقت فطری ہے، اسی طرح جان داروں کی دنیا میں بھی ان کے درمیان بقا کے لیے کشاکش فطری ہے۔

ڈارون کی فکر پر مندرجہ بالا اثرات کا تذکرہ ماہر حیاتیات جان اسمتھ (John Maynard Smith) نے اپنی کتاب Theory of Evolution (نظریہ ارتقاء) کے باب دوم میں کیا ہے۔ یہ کتاب کیمبرج یونیورسٹی پریس سے 1995 میں شائع ہوئی۔ مذکورہ باب کا عنوان ہے: Natural Selection یعنی فطری انتخاب۔

## ابتدائے حیات

ڈارون کی کتاب کا آخری جملہ اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ابتداء میں ایک نوع کے ایک فرد یا چند انواع کے چند افراد میں زندگی پھونکی گئی، پھر دیگر انواع ارتقاء کے عمل کے نتیجے میں طویل عرصے میں وجود میں آئیں۔ گویا ڈاروں ایک نوع یا چند انواع کے ابتدائی افراد کی حد تک زندگی کے یک لخت (Spontaneous) آغاز کو تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح خالق کے رول کی گنجائش نکل آتی ہے۔ تاہم بعد کے ماہرینِ حیاتیات کے دور میں چوں کہ مغرب کا مذہب مخالف رجحان اور زیادہ فروغ پا چکا تھا، اس لیے ان میں سے بہت سے محققین زندگی کی ابتداء کو اتفاقی واقعہ سمجھتے ہیں (گویا زندگی کے پھونکے جانے، یعنی خالق کی تدبیر کو تسلیم نہیں کرتے)۔

مثال کے طور پر انگریز ماہر حیاتیات ہالڈین (J.B.S.Haldane - 1892 - 1964) نے 1929 میں ابتدائے حیات کے موضوع پر مقالہ لکھا، جو The Rationalist Annual نامی جریدے میں شائع ہوا۔ مقالے میں ہالڈین نے یہ خیال پیش کیا کہ زمین پر زندگی کا آغاز تین مراحل سے گزرا ہے:

(الف) اول جب زمین کی سطح خاصی ٹھنڈی ہوگئی تو سورج کی بالائے بنفشی شعاعوں کے اثر کے نتیجے میں بڑے سائز کے سالمے (Organic Molecules) وجود میں آئے۔ یہ سالمے پانی، کاربن ڈائی آکسائڈ اور امونیا کے ساتھ سورج کی شعاعوں کے کیمیاوی تعامل کا نتیجہ تھے۔

(ب) یہ کیمیاوی عمل جاری رہا اور ان سالموں کا سائز مزید بڑا ہوا اور رفتہ رفتہ ان میں یہ صلاحیت پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے سے مشابہت رکھنے والے دیگر سالموں کو وجود میں لاسکیں۔ (گویا ان میں اپنی 'نسل' بڑھانے کی صلاحیت پیدا ہوگئی)۔

(ج) پھر ان بڑے سالموں نے زندہ Cell (خلیے) کی شکل اختیار کرلی۔ جب ایک بار اس طرح زندگی کا آغاز ہوگیا تو ارتقاء کے عمل کے نتیجے میں رفتہ رفتہ پیچیدہ جان دار وجود میں آتے چلے گئے۔ (واضح رہے کہ جسمِ انسانی میں خلیوں کی تعداد 400 کھرب کے قریب ہوتی ہے، گویا زمین کی موجودہ انسانی آبادی کی پانچ ہزار گنی۔ اس سے جسمِ انسانی کی پیچیدگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے)۔

ہالڈین نے آغازِ حیات کے جو مراحل بیان کیے ہیں ان میں کسی کے حق میں کوئی شواہد موجود نہیں ہیں۔ اس نے محض اپنے تخیل کی پرواز سے کام لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زندہ اجسام اور غیر زندہ اشیاء میں جو غیر معمولی امتیاز موجود ہے (اور اس کا ہر آن مشاہدہ کیا جاسکتا ہے) وہ اس امکان کو ناقابلِ تصور بنا دیتا ہے کہ محض کیمیاوی عمل کے ذریعے بے جان مادہ، ایک زندہ خلیے میں تبدیل ہوجائے۔ چنانچہ نظریۂ ارتقاء، زندگی کی ابتدا کی کوئی ایسی توجیہ نہیں کرتا جس کے حق میں دلائل موجود ہوں۔ معلوم ہوا کہ 'سادہ زندہ اجسام سے پیچیدہ زندہ اجسام کا وجود میں آنا ممکن ہے۔' محض یہی نظریۂ ارتقاء کا اصل دعویٰ ہے جن ماہرینِ حیاتیات نے ارتقاء کے مزعومہ آغاز سے پہلے کے قدم (یعنی خود زندگی کے آغاز) کے بارے میں بحث کی کوشش کی ہے وہ کوئی قابلِ غور یا قابلِ ذکر نظریہ نہیں پیش کرسکے ہیں۔ چنانچہ اگر ارتقاء کے ذریعے ایک نوع سے

دوسری نوع کا وجود مان بھی لیا جائے، تب بھی زندگی کی ابتدا کی توجیہ کے لیے، خالقِ کائنات کے تخلیقی رول کو مانے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

## نوع(Species) کے معنی اور اقسام

زمین پر اسّی لاکھ مختلف انواع موجود ہیں۔ ان کے سلسلے میں غور کرتے وقت یہ سوال فطری طور پر سامنے آتا ہے کہ خود 'نوع' کی تعریف کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں اختلافات کے باوجود، ماہرینِ حیاتیات میں جو جواب مقبول ہے وہ یہ ہے:

''نوع سے مراد جان داروں کا وہ مجموعہ ہے جن کی ظاہری ساخت میں مشابہت ہوتی ہے اور جن کے درمیان تناسل (Inter Breeding) ممکن ہے۔''

افرادِ نوع کے مابین تناسل کے ممکن ہونے سے ماہرین یہ مراد لیتے ہیں کہ ان کے اتصال سے جو آئندہ نسل پیدا ہو، اس سے مزید تناسل کا سلسلہ جاری رہ سکے۔ اصطلاحاً کہا جاتا ہے کہ یہ نسل بانجھ (Sterile) نہ ہو۔ اس بنا پر گھوڑے اور گدھے کو الگ الگ انواع قرار دیا جائے گا، اس لیے کہ خچر سے نسل آگے نہیں چلتی۔

جان داروں کی دنیا کی عظیم الشان وسعت اور تنوع کی بنا پر یہ ضروری ہے کہ ان کو قسموں میں تقسیم کیا جائے، یعنی Classify کیا جائے۔ جن جان داروں کی ساخت میں مشابہت ہو، ان کو ایک قسم سے متعلق سمجھا جائے گا۔ جان داروں کے مطالعے کی آسانی کے لیے ان کی قسموں کے مراتب متعین کیے گئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(الف) تمام جان داروں کی پانچ اقلیم (Kingdoms) ہیں۔ ان میں سے دو: جانور اور پودے ہیں۔ یہ سب سے بنیادی تقسیم ہے۔

(ب) ہر اقلیم کو چند فائلم (Phylum) نامی خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً جانور نامی اقلیم کے تحت کیڑے، ایک فائلم ہیں۔ ایک اور مشہور فائلم کا نام Chordata (کارڈیٹا) ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی یا اس کی ابتدائی شکل موجود ہوتی ہے۔

(ج) ہر فائلم کی بھی متعدد قسمیں ہوتی ہیں جن کو کلاس (Classes) کہا جاتا ہے۔ ابھی جس فائلم کا ذکر کیا گیا (یعنی کارڈیٹا) اس کی پانچ قسمیں (کلاسیز) ہیں۔ ان میں ایک مشہور قسم (کلاس) کا نام Mammalia (ممیلیا) ہے۔ یہ وہ جانور ہیں جو اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہیں۔

(د) مذکورہ بالا کلاسوں کا مطالعہ کریں تو ہر کلاس کو متعدد عالَموں (Orders) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک مشہور عالَم کا نام Primate (پرائمیٹ) ہے۔ اس سے متعلق جان دار رنگوں کی پہچان کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ (ان کا تعلق ممیلیا کلاس سے ہے)۔

(ہ) ہر عالَم سے متعلق جان داروں کی مزید تقسیم ضروری سمجھی گئی۔ چنانچہ ہر عالَم کو متعدد خانوادوں (Families) پر مشتمل سمجھا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا عالَم (پرائمیٹ) کے بھی کئی خانوادے ہیں ان میں سے ایک کا نام ہومی ندا (Hominidae) ہے، جس کے لفظی معنی 'انسان نما' کے ہیں۔

(و) جان داروں کے ہر خانوادے (Family) کی بھی کئی قسمیں متعین کی جاتی ہیں۔ ہر قسم کو جینس (Genus) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا خانوادے، 'انسان نما' کی ایک ذیلی قسم کا نام Homo (ہومو) ہے۔

(ز) جان داروں کی اس درجہ بندی کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ ہر جینس کو انواع (Species) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انسان ایک نوع ہیں۔ ایک نوع کے افراد کے مابین جنسی تعلق اور تناسل ممکن ہے۔ اس تعلق کے نتیجے میں اسی نوع کے مزید افراد جنم لیتے ہیں اور ان کے درمیان جنسی اتصال بھی بارآور ہوتا ہے (یعنی نئے پیدا ہونے والے افراد بانجھ نہیں ہوتے)۔

انسانوں کی نوع کا سائنسی نام ہوموسیپین (Homo Sapiens) ہے۔ مذکورہ بالا تفصیلات کو ایک خاکے کے ذریعے دکھایا جاسکتا ہے۔ اس خاکے کی تکمیل نوع یا Species پر ہوجاتی

ہے۔ ہر نوع میں بھی متعدد شاخیں ہوسکتی ہیں، لیکن ان کے مابین بارآور جنسی اتصال ممکن ہے۔ مثلاً کتے ایک نوع ہیں، البتہ کتوں کی بہت سی شاخیں یا نسلیں ہوتی ہیں۔ ان مختلف نسلوں کے افراد کے مابین جنسی تعلق ممکن ہے اور پیدا ہونے والے کتے بانجھ نہیں ہوں گے۔

| درجہ | مثال |
|---|---|
| اقلیم (Kingdom) | مثلاً جانور، پودے |
| ↓ | |
| فائلم (Phylum) | مثلاً کارڈیٹا (ریڑھ والے) |
| ↓ | |
| کلاس (Class) | مثلاً ممیلیا (دودھ پلانے والے) |
| ↓ | |
| عالَم (Order) | مثلاً پرائمیٹ |
| ↓ | |
| خانوادہ (Family) | مثلاً انسان نما (Hominidae) |
| ↓ | |
| جینس (Genus) | مثلاً ہومو (Homo) |
| ↓ | |
| نوع (Species) | مثلاً انسان |

## انسانی کاوشوں کے ذریعے انتخاب

ڈارون کی کتاب 'انواع کی ابتداء' کا پہلا باب Artificial Selection (انسان کے ذریعے انتخاب) کے موضوع پر ہے۔ کتاب کے باقی حصے میں اصل تصور جو پیش کیا گیا ہے، وہ فطری انتخاب (Natural Selection) کا ہے، یعنی جان داروں کی اس دنیا میں مقابلہ آرائی جاری ہے۔ جو جان دار، اپنے قریبی طبعی ماحول سے سازگاری کر سکتے ہیں وہ زندہ رہ پاتے ہیں (باقی ختم ہوجاتے ہیں)۔ اس طرح فطرت ہر نوع کے موجود افراد میں سے ان کا انتخاب کرلیتی ہے جو ساخت اور خصوصیات کے اعتبار سے قریب میں موجود ماحول سے مطابقت رکھتے ہیں۔ سازگاری کی صلاحیت رکھنے والے یہ افراد اپنی نئی نسل کو اپنی منفرد خصوصیات منتقل کرتے ہیں اور ہر آنے والی نسل میں یہ امتیازی خصائص پختہ تر ہوتے جاتے ہیں۔ اپنی کتاب کے پہلے باب میں ڈارون کہتا ہے کہ پالتو جانوروں کی بہتر نسل حاصل کرنے کے لیے انسان بھی اس طرح کی کاوشیں کرتا رہا ہے، جو فطری انتخاب سے مماثلت رکھتی ہیں۔

انسان کے پالتو جانوروں میں مویشی مثلاً بھیڑ، بکری، گائے، بھینس شامل ہیں، جن سے زراعت میں خدمت لی جاتی ہے اور دودھ حاصل کیا جاتا ہے۔ بار برداری اور سواری کے لیے بہت سے جانور پالے جاتے ہیں، مثلاً گھوڑے، گدھے وغیرہ۔ شکار میں مدد اور رکھوالی کے لیے لوگ کتے پالتے رہے ہیں۔ اسی طرح بہت سے پرندے: طوطا، مینا، کبوتر وغیرہ شوقیہ پالے جاتے رہے ہیں۔ خطوط پہنچانے کا کام بھی کبوتروں سے لیا گیا ہے۔

انسان کی کوشش رہی ہے کہ پالتو جانوروں سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے۔ مثلاً گھوڑوں کی قدوقامت زیادہ ہو، کتوں کی قوتِ شامہ تیز ہو اور پرندوں کی قوتِ پرواز زیادہ ہو۔ اس مقصد کے لیے جانور پالنے والے طے کرتے ہیں کہ ایک نوع کی کن نسلوں کو فروغ دیا جائے (جن کو اعلیٰ نسل سمجھا جاتا ہے) اور کن نسلوں کو تناسل کا موقع نہ دیا جائے (جو ادنیٰ سمجھی گئیں) تاکہ وہ بتدریج فنا ہوجائیں۔ اس طرح زیادہ ترقی یافتہ نسلیں باقی رہتی ہیں (جو انسان کے لیے مفید تر ہیں) اور نامطلوب نسلیں ختم ہوجاتی ہیں۔ یہ انسان کے ذریعے انتخاب ہے، جس کا مطالعہ وحشی جانوروں کی دنیا میں جاری فطری انتخاب کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔

ڈارون کی اس مثال سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ کسی نوع

کی متعدد نسلوں میں وہ نسلیں دنیا میں باقی رہتی ہیں جو سازگاری کرسکتی ہوں (خواہ طبعی ماحول کے لیے سازگار ہوں یا پالتو جانوروں کا معاملہ ہوتو انسانی ضروریات کے لیے سازگار ہوں)۔لیکن اس مثال سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ایک نوع سے اس سے مختلف نوع وجود میں آجاتی ہے۔ پالتو جانوروں کی بہتر نسل حاصل کرنے کے لیے انسانوں کا تجربہ یہ تو ثابت کرتا ہے کہ بہ تدریج انتخاب کے ذریعے نسبتاً طاقت ورگھوڑے حاصل کیے جاسکتے ہیں،لیکن اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ گدھا گھوڑے میں تبدیل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ڈارون کے تصور کے مطابق فطری انتخاب کے نتیجے میں ارتقاء (یعنی تبدیلی انواع) کا عمل کس طرح واقع ہوتا ہے؟

## جینیات کا علم

مندرجہ بالا سوال کا جواب دینے کے لیے جینیات کے موضوع کا تذکرہ ضروری ہے۔اس موضوع کے تحت جین نامی مادے کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں حیاتیات کے نئے شعبے کی ابتدا ہوئی،جس کو Genetics (جینیات) کا نام دیا گیا۔اس شعبۂ علم کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں،تاہم اس کو باضابطہ شکل دینے میں نمایاں کام امریکی ماہر حیاتیات تھامس مارگن (1945 - 1866) نے کیا۔1915 میں مارگن نے تین اور ماہرین کے ساتھ مل کر اپنی مشہور کتاب شائع کی،جس کتاب کا نام ہے: Mechanism of Mendelian Heredity (خصائص کی منتقلی کا عمل)۔ یہ کتاب انیسویں صدی کے محقق منڈل (1884-1822) کے خیالات کی اصولاً تائید کرتی ہے۔منڈل نے پہلی مرتبہ ان قوانین کو ترتیب دینے کی کوشش کی جن کے مطابق (جان داروں کی دنیا میں) ماں باپ کی خصوصیات، بچوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ البتہ منڈل کے زمانے میں جین (Gene) کی دریافت نہیں ہوئی تھی۔اس لیے اس کے پیش کردہ قوانین محض تجرباتی نوعیت رکھتے تھے۔ مارگن کے دور میں جین کی دریافت کے ساتھ ان تجرباتی قوانین کی توجیہ ممکن ہوسکی۔ 1933 میں مارگن کو اپنی تحقیقات کے لیے نوبل انعام ملا۔

سوال یہ ہے کہ جین (Gene) کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کا تعلق جان داروں کی جسمانی ساخت کی بنیادی اکائیوں یعنی خلیوں (Cells) سے ہے۔ ہر جان دار کا جسم خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ان خلیوں کے ذریعے جسم اپنے مختلف کام انجام دیتا ہے۔خلیوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، چنانچہ انسانی جسم میں اوسطاً 400 کھرب خلیے موجود ہوتے ہیں۔

خلیے کا مرکزی حصہ نیوکلیس کہلاتا ہے۔اس میں ڈی این اے نامی مادہ موجود ہوتا ہے، جو ایک قسم کا ایسڈ ہے۔ڈی این اے میں جان داروں کی ساری خصوصیات کا بیان موجود ہوتا ہے۔ڈی این اے کے یہ سالمے سیل کے نیوکلیس میں موجود (ہسٹون نامی) پروٹین پر لپٹے ہوتے ہیں اور کروموزوم کہلاتے ہیں۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ ڈی این اے میں کس جان دار کی خصوصیات کا بیان کس صورت میں موجود ہوتا ہے؟ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اے، جی، سی اور ٹی نامی چار الگ الگ طرح کے اساسی مادے ڈی این اے میں موجود ہوتے ہیں۔ان اساسی مادوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، یعنی تقریباً تین ارب (انسانی جسم کے ہر سیل میں)۔جس طرح کسی زبان کے حروف کو ترتیب دینے سے الفاظ اور الفاظ سے جملے بن جاتے ہیں اسی طرح ان چار اساسی مادوں (اے، جی، سی، ٹی) کی ایک مخصوص ترتیب سے اس جان دار کے بارے میں ایک 'بیان' تشکیل پاتا ہے۔ ہر فرد کے لیے یہ بیان مختلف ہوتا ہے۔

انسانی جسم کے ہر خلیے میں 46 کروموزوم ہوتے ہیں، جو 23 جوڑوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ہر کروموزوم میں متعدد جین (Genes) ہوتے ہیں۔جین کی تعداد فی (انسانی) سیل 30 ہزار کے قریب ہوتی ہے۔کروموزوم جوڑے کی شکل میں ہوتے ہیں۔ ہر جوڑے کا ایک کروموزوم اس فرد کو اپنے والد سے وراثت میں ملا ہوتا ہے اور دوسرا اپنی والدہ سے۔اسی اعتبار سے ہر فرد میں موجود جین بھی جوڑے کی شکل

میں ہوتی ہیں۔ ہر جوڑے کی ایک جین والد سے ملی ہوتی ہے اور دوسری والدہ سے۔ چنانچہ جین کروموزوم کے ایک حصے کا نام ہے۔

ایک فرد کے جسم کے خلیوں میں موجود جین، اس کی جسمانی خصوصیات متعین کرتی ہیں، مثلاً آنکھ کا رنگ، بالوں کا رنگ وغیرہ۔ والدین سے بچوں کو یہ جین منتقل ہوتی ہیں۔ اس بنا پر بچوں اور والدین میں مشابہت ہوتی ہے۔

## انواع کا فرق

ڈی این اے کا مطالعہ کریں تو جان داروں کی ایک نوع اور دوسری نوع میں فرق درج ذیل تین بنیادوں پر ہوسکتا ہے:

☆ اساسی مادوں (یعنی اے، جی، سی، ٹی) کی تعداد کا فرق (یہ تعداد بطور مثال انسانوں میں تین ارب، جب کہ فروٹ فلائی نامی مکھی میں 15 کروڑ ہے)۔

☆ کروموزوم کی تعداد (انسانوں میں فی سیل 46 کروموزوم ہوتے ہیں جب کہ فروٹ فلائی میں 8 کروموزوم ہوتے ہیں)۔

☆ سیل میں جین کی تعداد (انسانوں میں یہ تعداد 30 ہزار، جب کہ فروٹ فلائی میں 13 ہزار ہے)۔

ڈی این اے مادے کی اس طرح کی خصوصیات کا مطالعہ کر کے ایک نوع اور دوسری نوع کے مابین فرق کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

اَب رہا ایک ہی نوع کے دو افراد کا فرق تو وہ ان بنیادی خصوصیات کی سطح پر واقع نہیں ہوتا (مثلاً کسی انسان میں کروموزوم کی تعداد 46 سے مختلف نہیں ہوسکتی)۔ ایک ہی نوع کے دو افراد کا باہمی فرق کروموزوم میں موجود جین کی ترتیب میں ہوسکتا ہے۔ چنانچہ دو انسانوں کے ڈی این اے میں 99 فی صد مشابہت ہوتی ہے، محض ایک فی صد کے قریب فرق ہوتا ہے۔ یہی ایک فی صد فرق ایک فرد کو دوسرے سے مختلف بنانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

## نئی نسل کی پیدائش

بچے والدین سے مشابہت رکھتے ہیں، لیکن مکمل مشابہت نہیں رکھتے۔ بچوں اور والدین میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ اس کا سبب پیدائش کے طریقے سے تعلق رکھتا ہے۔ جو سیل نئی نسل کی پیدائش میں حصہ لیتے ہیں وہ مردوں میں اسپرم سیل اور عورتوں میں انڈے (Egg) سیل کہلاتے ہیں۔ جسم کے دیگر خلیوں کے برعکس ان خلیوں (اسپرم اور انڈوں) میں محض 23 کروموزوم ہوتے ہیں۔ (46 نہیں ہوتے)۔ جب اسپرم سیل اور انڈا سیل ملتے ہیں تو زائگوٹ (Zygote) نامی سیل بنتا ہے۔ یہ بچے کی ابتدا ہوتی ہے۔ تقسیم در تقسیم کے ذریعے یہ ابتدائی سیل، پورا جان دار بن جاتا ہے۔ زائگوٹ میں پورے 46 کروموزوم ہوتے ہیں۔ (23 باپ کے اسپرم سے حاصل ہوئے اور 23 ماں کے انڈا سیل سے ملے)۔ کوئی جان دار بڑا ہوتا ہے تو جو عام خلیے اس کے جسم میں موجود ہوتے ہیں ان میں سے بعض جنسی خلیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک عام سیل (جو پورے 46 کروموزوم رکھتا ہے) تقسیم ہوتا ہے اور ایک کے بجائے دو سیل بن جاتے ہیں، جو ہو بہو مشابہ ہوتے ہیں، پھر اگلے مرحلے میں یہ دو سیل مزید تقسیم ہوتے ہیں اور کل چار سیل تیار ہو جاتے ہیں، البتہ یہ چار سیل، ابتدائی سیل کے مقابلے میں صرف 23 کروموزوم (فی سیل) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ جنسی سیل ہیں۔ نر جان دار میں یہ اسپرم اور مادہ جان دار میں انڈا سیل کہلاتے ہیں۔

اس عمل کو اس طرح ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

(الف) جان دار فرد کا عام سیل

(46 کروموزوم پر مشتمل، 23 ماں سے ملے اور 23 باپ سے) اس سیل کو 'الف' کہیے)

↓

یہ 'الف' سیل دو میں تقسیم ہوا۔ جو دو سیل بنے، وہ بالکل ایک جیسے تھے اور ہر سیل 46 کروموزوم رکھتا تھا۔ ان کو 'ب' اور 'ج' کہیے۔

↓

پھر مزید تقسیم ہوئی:

ب(46 کروموزوم)　　　ج(46 کروموزوم)

↓

↓

د(23 کروموزوم)،ہ(23 کروموزوم)

و(23 کروموزوم)،ز(23 کروموزوم)

د،ہ،و،ز عام سیل نہیں ہیں، بلکہ جنسی سیل ہیں۔

اگر متعلقہ فرد نر تھا تو یہ اسپرم سیل ہیں۔ اگر مادہ تھی تو یہ انڈا سیل ہیں۔

نر اور مادہ کے جنسی ملاپ کے بارآور ہونے کی صورت میں نر کا اسپرم سیل مادہ کے انڈا سیل سے مل کر زائگوٹ بناتا ہے۔

## والدین اور بچوں کے مابین فرق

درج بالا خاکے میں سیل کی تقسیم کے دو مراحل دکھائے گئے ہیں۔ دوسرے مرحلے میں 'ب' اور 'ج' سے بالترتیب 'د'،'ہ' اور 'و'، 'ز' ظہور میں آتے ہیں۔ یہ مرحلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تقسیم سے پہلے بھی 'ب' کے 46 کروموزوم، 23, 23 کے دو سیٹ کی شکل میں ہوتے ہیں۔ یہ سیٹ ایک ساتھ سیل میں موجود ہوتے ہیں، تاہم ایک دوسرے سے ممیز ہوتے ہیں۔ ایک سیٹ متعلقہ فرد کو اپنے باپ سے ملتا ہے اور دوسرا ماں سے۔ جب 'ب' کی تقسیم کے دوران 'ب' کے 46 کروموزوم کے دو حصے (23,23 کروموزوم والے) ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں تو جدا ہونے سے قبل بسا اوقات ان کے مابین جینی مادّے (Genetic Material) کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اس لیے (بطورِ مثال) سیل 'د' کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سیل 'ب' کے ایک سیٹ کی ہو بہو نقل ہوگا (بلکہ اس سے کسی قدر مختلف بھی ہوسکتا ہے)۔ چنانچہ اگر زید نامی فرد کے اندر، جنسی سیل بننے کا یہ عمل ہوا (یعنی اسپرم سیل وجود میں آیا) تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اسپرم سیل، زید کے والدین میں سے محض ایک کی خصوصیات کا حامل ہوگا، بلکہ اس میں دوسرے کی خصوصیات بھی شامل ہوسکتی ہیں۔ ان خصوصیات کے تناسب کے درجات بھی مختلف ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ سیل 'د' کو سیل 'ب' کے نصف کے ہو بہو مشابہ یا قائم مقام نہیں کہا جاسکتا۔ نتیجتاً اسپرم سیل یعنی 'د' نامی سیل زید کی خصوصیات کا مکمل آئینہ دار نہیں۔ اس کو یوں سمجھئے کہ اگر بالفرض 'د' اور 'ہ' کو دوبارہ ملا کر 46 کروموزوم والا ابتدائی سیل بنانا ممکن ہوتا تو جو کچھ بنتا وہ 'ب' نہ ہوتا بلکہ اس سے کچھ مختلف ہوتا۔ اب 'د' نامی سیل، زید کی اہلیہ کے انڈا سیل سے ملے گا تو زید کے بچے کی پیدائش ہوگی۔ اس بچے کی خصوصیات ایک حد تک زید سے مشابہ ہوں گی، مگر مکمل مشابہت نہ ہوگی۔ اسی طرح بچہ اپنی والدہ (زید کی اہلیہ) سے بھی مکمل مشابہت نہ رکھے گا، بلکہ کچھ مشابہت ہوگی۔

## تنوع اور ارتقاء

تنوع (Variation) نظریۂ ارتقاء کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے، والدین سے کسی قدر مختلف ہوتے ہیں۔ اس تنوع کے سبب کا ابھی تذکرہ کیا گیا، یعنی بالغ جان دار کے اندر جنسی سیل بننے کے عمل کے دوران ابتدائی سیل کے دو حصوں میں جینی مادے (Genetic Material) کا ممکنہ تبادلہ۔ اس تبادلے کے نتیجے میں بچوں کے خصائص، والدین سے کسی قدر مختلف ہوجاتے ہیں۔

نظریۂ ارتقاء کہتا ہے کہ اگر یہ خصائص ایسے ہوں کہ بچے گرد و پیش کے طبعی ماحول کے لیے زیادہ موزوں (سازگار یا Adapted) ثابت ہوں تو وہ دوسرے کم موزوں، افرادِ نوع کے مقابلے میں طویل تر زندگی پائیں گے۔ پھر یہ بچے بالغ ہوں گے، تو ان کی خصوصیات، جو انہیں سازگار بناتی ہیں، ان کی آئندہ نسل تک (بڑی حد تک) منتقل ہوں گی۔ اس طرح ہر آنے والی نسل، پچھلی سے زیادہ، موجود طبعی ماحول کے لیے موزوں تر ثابت ہوگی۔ نسلوں کی خصوصیات کا یہ فرق وقت کے ساتھ بڑھتا جائے گا، یہاں تک کہ

اتنا زیادہ ہوجائے گا کہ ایک دوسری نوع وجود میں آ جائے گی۔

یہ تنوع کا ایک سبب ہے، یعنی جینی مادے کا تبادلہ۔ ایک نوع کے افراد کے مابین تنوع کا ایک اور سبب بھی بتایا جاتا ہے۔ اس کو Mutation (تغیر) کہتے ہیں۔ تغیر کا تعلق، جان داروں میں موجود خلیوں کی تقسیم سے ہے۔ ایک فطری عمل کے طور پر جان داروں کے جسم میں موجود خلیے تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ ایک خلیہ تقسیم ہوتا ہے تو دو خلیے وجود میں آتے ہیں، جو ابتدائی خلیے کی ہو بہو نقل ہوتے ہیں۔ البتہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس 'نقل' میں کچھ غلطی ہوجاتی ہے۔ نتیجتاً سیل 'الف' سے بننے والے 'ب' اور 'ج' خلیے، ممکن ہے 'الف' سے تھوڑے سے مختلف ہوجائیں۔ عموماً یہ اختلاف کروموزوم کے اجزاء (یعنی جین) کی ترتیب میں ہوتا ہے۔ جو خلیہ تغیر سے دوچار ہوا، اگر وہ متعلقہ جان دار فرد کا جنسی خلیہ نہ ہو تو اس تغیر کا کوئی اثر آئندہ نسل پر نہیں پڑتا، البتہ اگر اسپرم سیل یا انڈا سیل میں تغیر ہو تو آئندہ نسل پر اثر پڑے گا۔ جان دار (یعنی والد یا والدہ) اور بچوں کے درمیان فرق کا ایک سبب یہ تغیر ہوسکتا ہے۔

گویا بچے، والدین سے کسی قدر مختلف ہوتے ہیں۔

**اس کی دو وجوہ ہیں:**

(الف) جنسی سیل بننے کے دوران، جینی مادے کا تبادلہ اور

(ب) سیل کی تقسیم کے دوران 'نقل' تیار ہونے میں غلطی۔

ان دو اسباب میں جو سبب بھی ہو، وہ بچوں کو والدین سے مختلف بناتا ہے۔ ایک بار یہ تنوع واقع ہوجائے تو باقی رہتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے، بہ شرط یہ کہ تنوع مفید ہو (یعنی فرد متعلق کو ماحول کے لیے موزوں تر بنائے)۔ تنوع کا یہ تسلسل بالآخر، نوع کی تبدیلی پر منتج ہوتا ہے۔ یہی ارتقاء ہے۔

## نظریۂ ارتقاء پر تنقید

خالقِ کائنات کی تدبیر کا انکار کرنے والے نظریہ ارتقاء کو زور و شور سے پیش کرتے ہیں، لیکن اس نظریے میں متعدد بنیادی کمزوریاں موجود ہیں:

(الف) یہ نظریہ ابتدائی نوع سے پیچیدہ تر انواع کے وجود میں آنے کی توجیہ کا دعویٰ کرتا ہے، مگر خود ابتدائی انواع کے وجود میں آنے کی کوئی توجیہ نہیں کرتا۔ گویا اس نظریے میں حیات کے ارتقاء کی تعبیر پیش کی گئی ہے، لیکن حیات کی ابتداء کی کوئی توجیہ پیش نہیں کی گئی۔

(ب) اس نظریے کی تائید میں ڈارون نے پالتو جانوروں کے سلسلے میں انسانی تجربات کو پیش کیا ہے۔ ان تجربات سے نوع کی تبدیلی ثابت نہیں ہوتی، صرف ایک نوع کی بہتر نسل کے حصول کا امکان ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ نظیر، نظریۂ ارتقاء کے اصل دعوے (انواع کی تبدیلی) کی تائید نہیں کرتی۔

(ج) نظریۂ ارتقاء کی بنیاد فطری انتخاب (Natural Selection) کا تصور ہے، یعنی فطرت موزوں تر افرادِ نوع کا انتخاب کرتی ہے۔ 'فطری انتخاب' کی اساس ایک نوع کے مختلف افراد کے مابین تنوع (Variation) ہے۔ تنوع نہ ہو تو ارتقاء نہیں ہوسکتا۔ تنوع کی ایک صورت جینی مادے کا تبادلہ ہے۔ یہ تبادلہ ایک جان دار کے جسم کے سیل کی تقسیم کے دوران ہوتا ہے۔ اس سے نوع کی تبدیلی ممکن نہیں۔ فرد میں موجود جینی مادہ، اس نوع کے لیے خاص ہے۔ اس کے اجزاء کی ترتیبِ نو سے جینی مادے کی نوعی ماہیت نہیں بدلتی۔

(د) مذکورہ بالا تنوع (Variation) کا دوسرا سبب سیل کی تقسیم کے وقت نقل کی غلطی (Mutation) ہے۔ آیئے دیکھیں کہ اس تغیر (Mutation) کی رفتار کیا ہے؟

انسانوں سے متعلق اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان کے جسم کے سیل میں Spontaneous (اتفاقی) تغیرات سال میں دو یا تین ہوسکتے ہیں۔ اگر یہ تغیرات سب کے سب مفید ہوں (جس کا امکان بہت کم ہے، اس لیے کہ مضر تغیرات زیادہ ہوتے ہیں) اور یہ سب جمع ہوتے جائیں تب بھی ان کا مجموعی اثر (ایک نسل میں) ناقابلِ لحاظ ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ دو یا تین تغیرات (سالانہ) کہاں واقع ہوتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تغیرات جین کے اس اساسی جز میں واقع ہوتے ہیں جس کو اساسی جوڑ (Base Pair) کہا جاتا ہے۔ انسانی جسم کے خلیے میں 30 ہزار جین موجود ہوتے ہیں اور ایک جین میں اوسطاً ایک لاکھ اساسی جوڑے پائے جاتے ہیں۔ ہر جین جان دار فرد کی کسی نہ کسی جسمانی خصوصیت (مثلاً قد وقامت، آنکھ کے رنگ، بال کے رنگ وغیرہ) کا سبب ہوتی ہے۔ (یعنی جین میں تبدیلی واقع ہو تو بطورِ مثال آنکھ کا رنگ بدل جائے گا)۔ اب ایک برس میں جین کے ایک لاکھ اساسی جوڑوں میں سے اگر دو یا تین بدل جائیں تو یہ تغیر کی انتہائی سست رفتار ہے۔

مائیکل کرسٹون (Michael Crichton) نے اپنی تصنیف 'عالم گم گشتہ' (The Lost World) میں ایک باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے: Problems of Evolution یعنی 'نظریہ ارتقاء کی خامیاں'۔ وہ سب سے سادہ جان دار کی مثال لیتا ہے، یعنی بیکٹیریا۔ بیکٹیریا کے اندر دو ہزار انزائم (Enzyme) نامی مادے ہوتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ان انزائم کے اتفاقی طور پر ترتیب پا جانے کے لیے جو وقت درکار ہے وہ پچاس ارب سال ہے۔ (جب کہ زمین کی عمر کا اندازہ محض پانچ ارب سال لگایا گیا ہے)۔ اس نظیر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 'اتفاقی تغیرات' کتنے سست رفتار ہوتے ہیں۔ ان سے نوع کی تبدیلی کیسے ہو سکتی ہے؟

(ہ) تاہم یہ سست رفتاری، یک لخت واقع ہونے والے تغیرات (Spontaneous Mutations) کا وصف ہے۔ ان کے علاوہ مصنوعی ذرائع سے بھی تغیر پیدا کرنا ممکن ہے۔ اس کے تجربات بعض کیڑوں پر کیے گئے ہیں، جن پر تجربہ گاہ میں شعاعیں ڈالی گئیں۔ شعاعوں کے اثر سے بعض اڑنے والے کیڑوں کے پروں کا رنگ (ان کی اگلی نسل میں) تبدیل کرنے میں کام یابی ہوئی۔ تاہم ایسے تمام تجربات میں نوع (Species) کی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، بلکہ اس نوع کی ایک مختلف نسل (Race) ظاہر ہوئی۔ چنانچہ تغیر اتنا سست رفتار تو نہیں رہا جتنا فطری حالات میں ہوتا ہے، لیکن نظریۂ ارتقاء کے اصل دعوے (یعنی نوع کی تبدیلی) کی تائید میں بھی کوئی مثال سامنے نہیں آئی۔

مصنوعی طرز پر تغیر کے یہ تجربات نئے اور انوکھے تو ضرور ہیں، لیکن نتائج کے اعتبار سے ان میں اور پالتو جانوروں کی بہتر نسل حاصل کرنے کے روایتی طریقوں میں کوئی فرق نہیں۔ چوں کہ نوع جوں کی توں رہتی ہے، اس لیے اس طرز کے تجربات پرانے ہوں یا نئے، نظریہ ارتقاء سے غیر متعلق (Irrelevant) سمجھے جانے چاہئیں۔

(و) ڈاروِن کی کتاب 'ابتدائے انواع' کے تیسرے باب کا عنوان ہے: 'تنازع للبقاء' (Struggle for Existence)۔ اس باب میں بتایا گیا ہے کہ وسائلِ ارضی کی محدودیت کے باعث ایک نوع کے مختلف افراد کے مابین کشاکش ہوتی ہے اور جو فرد زیادہ ماحول سے سازگاری کر سکتا ہے وہ زندہ رہتا ہے۔ اسی طرح مختلف انواع کے مابین بھی کشمکش ہوتی ہے۔ بقا کے لیے باہمی کشاکش اور تصادم کا یہ تصور، اس واقعے کے خلاف ہے جو ہمارا مشاہدہ ہے، یعنی ایک خطے میں موجود مختلف انواع کے درمیان تعاون ہوتا ہے اور وہ باہم مل کر ایک ہم آہنگ نظام (Eco System) کی تشکیل کرتی ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی کو پھول کی ضرورت ہوتی ہے اور پھول کو پھل بننے کے لیے شہد کی مکھی کی۔ ڈاروِن کا نظریۂ فطرت میں ہر طرف موجود ہم آہنگی اور تعاون کی کوئی توجیہ کرنے سے قاصر ہے، بلکہ اس واقعے سے ٹکراتا ہے۔

(ز) نظریۂ ارتقاء کے مطابق تنوع بتدریج واقع ہوتا ہے، چنانچہ جان داروں کے اجسام میں پیچیدہ افعال انجام دینے والے اعضاء کا ظہور بہ تدریج ہوا۔ بہ طور مثال آنکھ کا آغاز بہت سادہ شکل سے ہوا، پھر اس کی موجودہ شکل آہستہ آہستہ بنی، جو بہت پیچیدہ ہے۔ اس خیال پر تنقید کرتے ہوئے مائیکل کرسٹون کہتا ہے کہ اگر کئی تبدیلیاں ایک ساتھ واقع نہ ہوں تو وہ متعلقہ جان دار کے لیے بے کار ہیں۔ چمگادڑ کی مثال لیتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

’’چمگادڑ دیکھ نہیں سکتی، بلکہ لہروں کو محسوس کرکے آس پاس کی اشیاء کا پتہ چلاتی ہے اور اس احساس کے مطابق حرکت کرتی ہے۔ اس عمل کے ممکن ہونے کے لیے ضروری ہے کہ چمگادڑ کے جسم کے کئی اعضاء ایک ساتھ وجود میں آئے ہوں، یعنی ایسے اعضاء جن سے لہریں نکلیں، پھر وہ اعضاء جو لہروں کے ٹکرا کر واپس آنے کے بعد بازگشت کو محسوس کرسکیں۔ ان اعضاء کے علاوہ ایسا دماغ چاہیے جو بازگشت کو محسوس کرکے قریبی اشیاء کی ساخت کا اندازہ لگائے۔ پھر ایسے اعضاء درکار ہیں جو (بہ طور مثال) قریب کے کسی کیڑے کو پکڑ سکیں (جس کی موجودگی کا چمگادڑ کو احساس ہوا ہے)۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ یہ تمام ضروری اعضاء اتفاقاً ایک ساتھ وجود میں آگئے تو یہ اس طرح کا مفروضہ ہے کہ دھاتوں کے انبار میں دھماکہ ہوا اور ہوائی جہاز وجود میں آگیا۔‘‘

(’عالم گم گشتہ‘ از مائیکل کرسٹون)

(ح) نظریۂ ارتقاء انسان کی انسانی خصوصیات کی کوئی توجیہ نہیں کرتا، جن میں انسان بقیہ تمام جان داروں سے ممتاز ہے، مثلاً اخلاقی حس، عبادت کا جذبہ وغیرہ۔ جینیات (Genetics) نامی کتاب میں اس کا مصنف بیری (R.J. Berry) لکھتا ہے:

’’اس امر کے کوئی شواہد نہیں ہیں کہ انسانی معاشرے میں موجود اخلاقی قدریں ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔ ڈارون بھی اس کا قائل نہ تھا۔ اس خیال کا درست ہونا بہت مشکوک ہے کہ والدین رحم دل، نرم مزاج اور شریف النفس ہوں تو ان کے بچوں کے زندہ رہنے کے امکانات زیادہ ہوں گے (ان بچوں کے مقابلے میں جن کے والدین خود غرض یا دھوکے باز ہوں)۔ سائنس ابھی تک ان خصوصیات کی کوئی توجیہ کرنے سے قاصر ہے جن کو اعلیٰ انسانی خصائل کہا جاتا ہے، مثلاً احساسِ خیر و شر، صداقت، احساسِ ذمہ داری، شعورِ ذات، جمالیاتی حس وغیرہ۔ سائنس کا مزاج ایسا ہے کہ مستقبل میں بھی سائنسی طریق کار سے ان انسانی خصائص کی توجیہ نہیں کی جاسکے گی۔‘‘

(کتابِ مذکور، باب ۱۱)

(ط) کسی سائنسی نظریے کے قابل قبول ہونے کے لیے عموماً یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ مشاہدہ اس کی تصدیق کرے۔ نظریۂ ارتقاء کے بنیادی دعوے (یعنی ایک نوع سے دوسری نوع کے ظہور) کے حق میں کوئی مشاہدہ موجود نہیں۔ جو کچھ موجود ہے وہ ایک ہی نوع کی مختلف نسلیں (Races) ہیں۔ ان کے درمیان جنسی اتصال کے ذریعے نئی نسلیں ظاہر ہوتی ہیں، لیکن نئی نوع کے ظاہر ہونے کی کوئی نظیر نہیں۔

(ی) کسی سائنسی نظریے کے قابلِ قبول ہونے کے لیے عموماً ایک دوسری شرط کا بھی ذکر کیا جاتا ہے یعنی نظریہ پیشن گوئی کی صلاحیت رکھتا ہو (جسے Prediction کہا جاتا ہے)۔ ارتقاء کا نظریہ اس کسوٹی پر بھی پورا نہیں اترتا۔ نظریہ کہتا ہے کہ جان داروں میں تنوع واقع ہوگا، لیکن اس تنوع کی سمت اور درجہ بتانے سے قاصر ہے۔ ان امور کو اتفاق پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

## نظریۂ ارتقاء کا متبادل

نظریۂ ارتقاء کا متبادل یہ ہے کہ جان داروں کی دنیا میں

تنوع (Variation) کو تو تسلیم کیا جائے (کیوں کہ تنوع یعنی ایک نوع کے افراد کا باہم اختلاف ایک واقعہ ہے)، لیکن اس تنوع کا فطری نتیجہ ایک ہی نوع کی نئی نسلوں (Races) کے ظہور کو قرار دیا جائے (نہ کہ نئی انواع کے ظہور کو)۔ متبادل نظریے کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انواع کا باہم تعلق تعاون و ہم آہنگی کا ہے (نہ کہ کشاکش کا)۔

مزید برآں انواع کی دنیا کے مطالعے کے لیے یہ تو ضروری ہے کہ ان کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جائے، مثلاً جان داروں میں سے اکثر کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، یعنی جانور اور پودے (نباتات)، تاہم پودوں کی باہم مشابہت کے یہ معنی نہیں کہ نباتات کی مختلف انواع ایک دوسرے سے (بہ ذریعہ ارتقا) وجود میں آئی ہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کیمیاوی عناصر (Elements)، جن کی تعداد سو سے کچھ زیادہ ہے، ان کی دو بڑی قسمیں ہیں، یعنی دھات (مثلاً تانبہ، المونیم، پوٹاشیم وغیرہ) اور غیر دھات (مثلاً آکسیجن، ہیلیم، کلورین وغیرہ)۔ بعض عناصر دھات اور غیر دھات کے درمیان ہیں مثلاً سلیکون۔ یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ مختلف کیمیاوی عناصر کی طبعی و کیمیاوی خصوصیات کے نمایاں طور پر مختلف ہونے کے باوجود، تمام عناصر کے ایٹم جن ذرات پر مشتمل ہوتے ہیں وہ یکساں ہیں (یعنی الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران)۔ محض ذرات کی تعداد کا فرق، ایک عنصر کو دوسرے سے مختلف بنا دیتا ہے۔ سوڈیم کے ایٹم میں 11 الیکٹران، 11 پروٹان اور 12 نیوٹران ہوتے ہیں۔ سوڈیم دھات ہے اور عام درجۂ حرارت پر سوڈیم ٹھوس حالت میں ہوتا ہے۔ سوڈیم کے مقابلے میں نیون کو لیجیے۔ نیون (Neon) کے ایٹم میں سوڈیم کے ایٹم کے مقابلے میں محض ایک الیکٹران کم ہوتا ہے یعنی نیون کے ایٹم میں 10 الیکٹران، 10 پروٹان اور 10 نیوٹران ہوتے ہیں، لیکن نیون کی خصوصیات، سوڈیم سے بالکل مختلف ہیں۔ نیون غیر دھات ہے اور عام درجۂ حرارت پر گیس کی شکل میں پائی جاتی ہے۔

مختلف عناصر کے ایٹموں کی ماہیت کے یکساں ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ایک کیمیاوی عنصر ارتقائی عمل سے گزر کر دوسرا عنصر بن گیا، یا ایک دھات سے دوسری دھات بن گئی۔ اسی طرح جینی مادے (Genetic Material) میں مشابہت اس کی دلیل نہیں بن سکتی کہ ایک جان دار نوع کے ارتقا سے دوسری نوع وجود میں آئی۔

چنانچہ ارتقاء کے متبادل نظریے کے نکات یہ ہیں:

(الف) ہر نوع کے ابتدائی فرد کا جداگانہ ظہور۔

(ب) جنسی عمل کے نتیجے میں نوع کی آبادی میں اضافہ۔

(ج) نوع کے افراد کے مابین تنوع کی موجودگی۔

(د) اس تنوع کی والدین سے بچوں میں (جزوی) منتقلی۔

(ہ) تنوع کی منتقلی کے نتیجے میں ایک ہی نوع کی مختلف Races (نسلوں یا شاخوں) کا ظہور۔

(و) انواع کے درمیان تعاون (نہ کہ کشمکش)

(ز) انواع کے مابین (کم یا زیادہ) مشابہت کی بنیاد پر انواع کی مختلف قسموں کی نشان دہی۔

(ح) تنوع کا اصل سبب، جنسی سیل کی تشکیل سے قبل جینی مادے کے تبادلے کو قرار دینا، نہ کہ اتفاقی تغیر (Mutation) کو۔

## الجھن کا حل

اس متبادل نظریے کو سمجھنے میں نظریۂ ارتقاء کے قائلین کو ایک الجھن پیش آتی ہے۔ وہ غالباً یہ تصور کرتے ہیں کہ متبادل نظریہ پیش کرنے والوں کے نزدیک ہر نوع کا ایک ابتدائی بالغ فرد یک لخت سطحِ زمین پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ فطرت کی کارفرمائیوں میں اکثر جو تدریج ہم دیکھتے ہیں، یہ یک لخت ظہور کا منظر، اس سے مطابقت نہیں رکھتا، لیکن یہ غلط فہمی ہے، جو سرسری طور پر غور کرنے والوں کو لاحق ہوتی ہے۔

متبادل نظریہ کے مطابق یہ بھی ممکن ہے کہ ایک نوع کا

محض ایک ابتدائی سیل (زائگوٹ) یک لخت ظاہر ہو، پھر وہ تقسیم در تقسیم کے مرحلے سے گزرے (جیسا کہ رحمِ مادر میں گزرتا ہے)۔ اس طرح اس نوع کا پورا فرد بن جائے۔ جس طرح یہ عمل، رحم میں ہوتا ہے اسی طرح باہر بھی ہوسکتا ہے۔ یہ منظر، اس تدریج سے مطابقت رکھتا ہے جس کو فطری مظاہر میں دیکھنے کے ہم عادی ہیں۔

نظریۂ ارتقاء اپنی خامیوں کی بنا پر اس کا اہل نہیں کہ اس کو قبول کیا جائے۔ اس کے مقابلے میں متبادل نظریۂ علم و عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے، جس کے مطابق ہر نوع کی ابتداء خالق کائنات کے امر کے مطابق جداگانہ ہوئی ہے۔ اس کا امکان قوی تر ہے کہ یہ عملِ تخلیق تدریجی ہے، یعنی اس کا آغاز ایک خلیے سے ہوتا ہے، جس کی تقسیم در تقسیم سے جان دار فرد وجود میں آجاتا ہے۔

## قرآنی نقطۂ نظر

قرآن مجید نے جان دار انواع کی تخلیق کے سلسلے میں مختصر اشارے کیے ہیں۔ البتہ انسان کی تخلیق کا ذکر نسبتاً تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ قرآن مجید کے ارشادات ڈارون اور اس کے متبعین کے نظریۂ ارتقاء کی، یہی نہیں کہ تائید نہیں کرتے، بلکہ اس کی تردید کرتے ہیں۔ قرآن مجید کا نقطۂ نظر درج ذیل ہے:

(الف) خلق کی ابتداء اور اس کا اعادہ

اللہ تعالیٰ خلق کی ابتدا کرتا ہے اور اس کا اعادہ کرتا ہے:

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ (العنکبوت:۱۹)

(کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ کس طرح اللہ خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اس کا اعادہ کرتا ہے۔ یقیناً یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔)

أَمَّن يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (النمل:۶۴)

(وہ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے۔ اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں حصہ دار) ہے؟ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔)

اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (الروم:۱۱)

(اللہ ہی خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اس کا اعادہ کرتا ہے، پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے۔)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نوع کے ظہور کے دو مراحل ہیں: پہلے مرحلے میں نوع کی ابتدا ہوتی ہے، جب خالقِ کائنات اس نوع کے پہلے فرد کی تخلیق کرتا ہے۔ اس کا جوڑا بناتا ہے۔ ان نر اور مادہ کے ملاپ سے دوسرے مرحلے میں اس نوع کی نسل آگے بڑھتی ہے، جس کو 'اعادۂ خلق' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(ب) انسان کی تخلیق

انسان کی تخلیق کے بھی یہی دو مراحل ہیں یعنی ابتدا اور اعادہ۔ چنانچہ انسان کی ابتدا مٹی سے ہوئی (جس کے لیے طین یا تراب کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں)۔ پھر مرد اور عورت کا ملاپ ہوا، جو اعادہ ہے۔ اعادہ نطفے کے ذریعہ ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي

الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلاً ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ (الحج:۵)

(لوگو! اگر تم کو زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی (تراب) سے پیدا کیا ہے۔ پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی، تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں، ایک وقتِ خاص تک رحم میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں۔ تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو......)

یہ تذکرہ سورۂ مومنون (آیات: ۱۲۔۱۴) میں بھی ہے۔وہاں 'تراب' کے بجائے 'طین' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

(ج) مٹی سے ابتدا کے معنی

مٹی (تراب یا طین) کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا جسم، زمینی مادوں سے بنا ہے۔

وَاللّٰهُ أَنبَتَكُم مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتاً (نوح۔۱۷)

(اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا۔)

(د) زوج کی تخلیق

پہلا مرحلہ نوع کے ابتدائی فرد کی تخلیق کا ہے۔ دوسرے مرحلے میں نوع کی نسل کے آگے بڑھنے کے لیے اس ابتدائی فرد کے جوڑے (زوج) کی تخلیق کی گئی۔ اس طرح زوج کی تخلیق، ابتدا اور اعادہ کے درمیان کی کڑی ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيراً وَنِسَاءً (النساء:۱)

(لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی نفس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔)

(ہ) روح کا پھونکا جانا

تخلیق کے پہلے مرحلے میں جس ابتدائی فرد کا جسم بنایا گیا تھا اس جسم کو زندگی اس وقت ملی جب اللہ نے اس میں روح پھونکی۔ یہ ابتدائے حیات کی وہ توجیہ ہے جو مادی عوامل سے بالاتر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ محض مادی عوامل زندگی کے آغاز کی توجیہ نہیں کر سکتے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّىْ خَالِقٌ بَشَراً مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ۔ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِن رُّوحِىْ فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِيْنَ (الحجر:۲۸،۲۹)

(اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔)

درج بالا آیات زندہ انواع کے ظہور کا قرآنی نظریہ پیش کرتی ہیں، جس کے بنیادی نکات: ابتدائے خلق، روح کا پھونکا جانا، زوج کی تخلیق اور نطفے کے ذریعے مزید افرادِ نوع کی پیدائش ہیں۔ تمام مشاہدات اس نظریے کی تصدیق کرتے ہیں۔

صحت
و
مرض

# کروناوائرس

## حیاتیاتی جنگ
## (Biological Warfare)
## کا ایک نیا ٹریلر

طالب جلال
(دارالعصر، نئی دہلی)

### حیاتیاتی جنگ کیا ہے؟

اس کو دوسرے الفاظ میں جراثیمی جنگ بھی کہا جاتا ہے۔اس میں بیکٹیریا، متعدی ایجنٹس، فنجس، وائرس اور کیڑے مکوڑے وغیرہ کا استعمال کر کے جاندار اور حیاتیاتی نقل تیار کیا جاتی ہے۔ یہ ایک طرح کی حیاتیاتی دہشت گردی (Bioterrorism) ہے۔

حیاتیاتی ہتھیار (Biological weapon) یا جراثیمی ہتھیار اعلانیہ اور خفیہ طور پر مختلف ممالک تیار کرتے رہے ہیں۔ اگر چہ ایک سو ممالک نے 1972 میں ایک معاہدہ کی رو سے فیصلہ کیا تھا کہ انھیں تیار نہ کیا جائے اور نہ ہی ذخیرہ کیا جائے مگر حیرت انگیز طور پر انھیں استعمال کرنے پر اس معاہدہ میں کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ حالانکہ 1925 میں جنیوا میں ایک معاہدہ کے تحت ان کے استعمال پر عالمی پابندی لگائی گئی تھی۔

جنگی لحاظ سے ایک اچھا حیاتیاتی ہتھیار اسے سمجھا جاتا ہے جس کے جراثیم ایک سے دوسرے فرد کو تیزی سے لگ جاتے ہوں، ہوا کے ذریعے پھیل سکتے ہوں اور جلدی تیار کیے جاسکتے ہوں مگر اس کا توڑ بھی موجود ہوتا کہ اپنے لوگوں کو اس سے بچایا جاسکے۔

حیاتیاتی یا جراثیمی ہتھیار قدیم زمانے سے استعمال میں ہیں۔ پہلے ان کی صورت یہ تھی کہ دشمن کے پانی کے ذرائع کو زہر آلود کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ جراثیموں سے ناواقفیت کے باوجود دشمن کے پانی کے ذرائع میں فنجس اور ایسے پودے ڈالنے کی مثالیں بھی موجود ہیں جن سے اس پانی کے پینے والے بیمار ہو جائیں یا مر جائیں۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ طاعون کے مریضوں کی لاشوں کو دشمن کے علاقے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ مثلاً 1710 میں روس نے سویڈن کے ساتھ جنگ میں ایسا ہی کیا۔ امریکا میں یورپی لوگوں نے بہت سی ایسی بیماریاں پھیلائیں جن سے امریکا کے قدیمی باشندے لاکھوں کی تعداد میں مرے۔ اس کا تذکرہ لارڈ جیفرے ایمھرسٹ نے کیا ہے۔ کہ 1756-1763 میں فرانسیسیوں نے امریکا کے قدیمی باشندوں (ریڈ انڈین) میں ایسے کمبل تقسیم کیے جن میں خسرہ کے جراثیم تھے یعنی انھیں ایسے لوگوں نے استعمال کیا تھا جن کو خسرہ تھا۔ یاد رہے کہ امریکہ میں اس سے پہلے یورپی بیماریاں نہیں تھیں اور اس سے مقامی باشندے آسانی سے موت کے منہ میں چلے جاتے تھے۔

ایسے ہی کمبل 1834 میں رچرڈ ھنری نے سان فرانسسکو میں تقسیم کیے اور کئی مقامات پر بیچے۔ بیسویں صدی میں امریکہ میں با قاعدہ طور پر فورٹ ڈسٹرکٹ کی تجربہ گاہ میں کئی جراثیم جنگی نقطہ نظر سے تیار کیے گئے جن میں انتھراکس جیسے جراثیم شامل تھے۔ سرد جنگ کے دوران امریکہ اور روس نے اس میدان میں بہت تحقیق کی اور متعدد جراثیم اوران کے توڑ تیار کیے۔ کوریا کی جنگ (1950-1953) کے دوران امریکہ نے ان ہتھیاروں کو استعمال بھی کیا۔ امریکانے ہمیشہ ایسے الزامات سے انکار کیا ہے۔

ملاحظہ ہو: (Wartime lies published on June 27, New york Times 1999)

امریکہ میں حیاتیاتی جنگ کا ایک پروگرام 1942 میں سول ایجنسی ''وار ریز روسروس'' کوسونپا گیا، چنانچہ 1950-53 کی کوریا وار میں روس، چین اور شمالی کوریا نے امریکہ پر الزام لگایا کہ وہ حیاتیاتی ہتھیار کا با قاعدہ استعمال کر رہے ہیں۔ بعد ازاں برطانیہ پر عمان کے خلاف اور امریکہ پر ہانگ کانگ اور عراق کے خلاف بائیولوجیکل ہتھیار استعمال کرنے کے الزامات لگے۔

کیوبا کئی دہائیوں سے امریکی ستم ظریفی کا شکار بتایا جاتا ہے۔ 1981ء میں کیوبا میں ڈینگو بخار وبا کی طرح پھیلا۔ اس نے کم از کم 158 شہریوں کی جان لی۔ ان میں سے 51 بچے تھے۔ کیوبا کے صدر فیڈل کاسترو نے اس وبا کا ذمے دار امریکہ کو ٹھہرایا اور اسے کیوبا کے خلاف امریکی حیاتیاتی جنگ قرار دیا۔

جراثیمی تحقیقاتی ادارہ کے مطابق برطانیہ اور امریکہ جہاں جراثیمی ہتھیار تیار کرنے والے ممالک میں سرفہرست ہیں وہیں ان کے علاوہ سترہ مزید ممالک پر بھی شبہ ظاہر کیا گیا ہے جن میں بھارت، اسرائیل، کوریا، روس، ایران، عراق، شام، مصر، چین، ویت نام، لاوس، کیوبا، بلغاریہ، جنوبی افریقہ، لیبیا، جنوبی کوریا اور تائیوان شامل ہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکا نے ایسے ہتھیار بھی تیار کیے تھے جو زراعت کو نقصان پہنچاتے ہوں مثلاً گندم اور چاول کی فصلوں کے مخصوص جراثیم جو کلسٹر بم کے ذریعے سے دشمن کے علاقے میں پھینکے جا سکتے ہوں یا ہوا میں چھڑکاؤ کیے جا سکتے ہوں۔ اگرچہ ظاہراً 1970 میں ان کی تیاری امریکہ نے بند کر دی تھی۔

برطانوی تجربہ گاہ ''اوکزی ٹیک'' نے ڈینگو بخار سے نپٹنے کے لیے جینیاتی متغیر مچھر تیار کیے۔ 2009ء میں یہ جزائر غرب الہند کے جزیرے ''گرینڈ کے مین'' میں چھوڑے گئے۔ 2010ء میں ایسے 30 لاکھ مچھر خفیہ طریقے سے چھوڑے گئے۔

ان موضوعات پر Jeffrey Alan Lockwood، professor of Natural Sciences and Humanities، University of Wyoming نے کئی وقیع کتابیں تصنیف کیں ہیں۔

ستمبر 2001 میں خود امریکا ایسے ہتھیاروں کا شکار ہونے لگا تھا جب امریکی کانگریسی اور دوسرے مشہور لوگوں اور دفاتر کو ایسے خط ملے جن میں انتھراکس کے جراثیم پاؤڈر کی شکل میں موجود تھے لیکن تا حال اس کے ذمہ داروں کا اور ان کے مقصد کا پتہ نہیں چل سکا اور بعض لوگ اسے ایک امریکی ڈراما سمجھتے ہیں۔

حیاتیاتی جنگ کی دنیا میں ایڈز کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ انسانی طور پر تیار کردہ جراثیموں کی مدد سے پھیلا۔ اور یہ جراثیم امریکہ نے اپنی ایک فوجی تجربہ گاہ میں تیار کیے تھے۔ یہ فوجی تجربہ گاہ فورٹ ڈسٹرکٹ، میری لینڈ، امریکا میں واقع ہے۔ اور USAMRIID کہلاتی ہے۔ یہ صرف ایک سازشی نظریہ نہیں بلکہ امریکہ اور مغربی دنیا کے بے شمار لوگ اس کے قائل ہیں اور اس سلسلے میں ان کی تحقیق بھی موجود ہے مثلاً:

ھیمبولٹ یونیورسٹی، جرمنی کے ایک پروفیسر جیکب سیگل کی تحقیق کے مطابق امریکی فوجی تجربہ گاہ میں یہ عمل دو جرثوموں Visna اور HTLV-1 کی مدد سے 1977 میں کیا گیا۔ یہ تجربہ

جیل کے کچھ قیدیوں کے اوپر کیا گیا جن کو جلدی رہا کرنے کا وعدہ کیا گیا۔اس پروفیسر پر امریکا نے روس کا جاسوس ہونے کا الزام لگایا

نوبل انعام یافتہ ونگاری متھائی (Wangari Maathai) کے خیال کے مطابق ایڈز کا جرثومہ حیاتیاتی ہتھیاروں کے تجربات کی پیداوار ہے۔ اور انسانی ہاتھوں سے بنا ہے۔

مصنف ڈاکٹر ایلن کینٹویل (Dr. Alan Cantwell) نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ایڈز کا جرثومہ جینیاتی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے اور امریکا میں اسے تیار کرنے والے تجربات کا ذمہ دار ڈاکٹر وولف زمونس (Dr. Wolf Szmuness) تھا۔

ملاحظہ ہو:

AIDS and the Doctors of Death:An Inquiry into the Origin of the AIDS Epidemic and Queer Blood:The Secret AIDS Genocide Plot, Dr. Alan -Cantwell

ڈاکٹر لیونارڈ ہوروز (Dr. Leonard G. Horowitz) نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ایڈز کا جرثومہ امریکی فوجی تجربات کی پیداوار ہے۔

ملاحظہ ہو:

Ebola.& AIDS:Emerging Viruses Nature, Accident or Intentional? and Death in the Air:Globalism, Terrorism and Toxic Warfare BY Dr. Leonard G. Horowitz

## وائرس کیا ہے؟

یہ دراصل ایک جاندار ہوتا ہے اور ایک لحاظ سے بے جان بھی۔ یہ اربوں کھربوں سال کہیں پڑا ہو تو پڑا رہے گا مرے گا نہیں۔ یہ جتنا ہوتا ہے اتنا ہی رہتا ہے۔اسے کسی قسم کی کوئی غذا درکار نہیں ہوتی۔ یہ جب تک کسی جاندار کے جسم میں نہیں جاتا اپنی تعداد بھی نہیں بڑھا سکتا۔ یہ ایک بیکٹیریا کے مقابل تقریباً سو گنا کم حجم رکھتا ہے۔اس کی قلمیں یعنی کرسٹلز بھی بنائی جا سکتی ہیں جیسے چینی یا نمک کی کرسٹلز ہوتی ہیں اور یہ پھر بھی زندہ ہوتا ہے۔

وائرس کی سینکڑوں اقسام ہیں اور یہ سینکڑوں بیماریاں بھی پیدا کرتا ہے۔اسے بیرونی ماحول میں صرف جلا کر ہی ختم کیا جا سکتا ہے لیکن جو شے نظر ہی نہیں آتی اسے جلانے کے لیے پوری دنیا کو جلانا پڑے گا۔اس کا واحد علاج انسانی جسم کا دفاعی نظام ہے۔جب یہ انسانی جسم میں داخل ہوتا ہے تو انسانی جسم میں موجود دفاعی نظام اور اس وائرس کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے۔ اکثر چھوٹے موٹے مقابلے جیسے نزلہ زکام وغیرہ میں تو حتمی فتح انسانی دفاعی نظام کی ہوتی ہے لیکن ایڈز کے سامنے یہ نظام بھی بے بس ہوتا ہے کہ ایڈز کا وائرس حملہ ہی دفاعی نظام پر کرتا ہے۔

وائرس کو آپ سادہ انداز میں ایک کوڈ سمجھ سکتے ہیں جسے فعال ہونے کے لیے ایک زندہ جسم یا خلیہ درکار ہوتا ہے جہاں وہ بھی زندہ ہو جاتا ہے اور آنا فانا اپنی تعداد بڑھانے لگتا ہے۔کرونا وائرس (COVID-19) بظاہر بخار سے شروع ہوتا ہے جس کے بعد خشک کھانسی آتی ہے۔ایک ہفتے بعد سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے، واضح رہے کہ اس انفیکشن میں ناک بہنے اور چھینکنے کی علامات بہت کم ہیں۔اس کا وائرس پھیپھڑوں پر حملہ کرتا ہے جس سے نمونیہ جیسی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ مرض کی شدت کی صورت میں پھیپھڑے کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور موت واقع ہو جاتی ہے۔ کرونا وائرس اب 40 ممالک تک پھیل چکا ہے۔چین میں اب تک کورونا وائرس سے 78 ہزار سے زائد افراد متاثر ہو چکے ہیں جبکہ 2700 ہلاک ہوئے ہیں۔

عالمی ادارہ صحت کے مطابق انفیکشن کے لاحق ہونے سے لے کر علامات ظاہر ہونے تک کا عرصہ 14 دنوں پر محیط ہے۔لیکن

کچھ محققین کا کہنا ہے کہ یہ 24 دن تک بھی ہوسکتا ہے۔ کرونا وائرس کیسے شروع ہوا؟ اس سلسلے میں تین آراء سامنے آئی ہیں:

ا۔ یہ وائرس زونوٹک (Zoonotic) ہے۔ یعنی اس کی اصل جانور میں پائی جاتی ہے اور یہ جانور سے انسان میں منتقل ہوا ہے۔ نامہ نگار ہیلن برگ کا تجزیہ ہے کہ چین کے کسی علاقے میں ہوا میں اڑتے ایک چمگادڑ نے اپنی لید میں کورونا وائرس چھوڑا یہ وائرس جنگل کی زمین پر گرا جہاں پینگولین نام کے جانور کو اس فضلے سے یہ وائرس ملا۔ یہ وائرس دوسرے جانوروں میں پھیلا۔ یہ متاثرہ جانور انسانوں کے ہاتھ لگا اور یہ بیماری انسانوں میں پھیلنی شروع ہوئی اور دنیا میں وبا کی شکل اختیار کرنے لگی۔

زولوجیکل سوسائٹی آف لندن کے پروفیسر اینڈریو کنگھم کا کہنا ہے کہ سائنسداں کسی جاسوس کی طرح ان واقعات کی کڑی جوڑنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جنگل میں کئی طرح کے جانوروں میں یہ وائرس ہوسکتا ہے خاص طور پر چمگادڑیں جن میں کئی طرح کے کرونا وائرس پائے جاتے ہیں۔

اس معمے کا دوسرا سوال اس پراسرار جانور کی شناخت ہے جس کے جسم میں یہ وائرس آیا اور اس سے ووہان کے بازار میں پہنچا۔ اس سلسلے میں پینگولین نام کے جانور پر شبہہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ چیونٹیوں اور دیگر کیڑے مکوڑوں کو کھانے والا یہ جانور دنیا میں سب سے زیادہ اسمگل ہونے والا جانور کہا جاتا ہے اور معدومیت کا شکار ہے۔

ووہان میں ایسے ہی ایک بازار کو وبا پھیلنے کے بعد بند کر دیا گیا جس میں جنگلی جانوروں کا ایک سیکشن بھی تھا جہاں زندہ اور ذبح شدہ جانوروں کو فروخت کیا جاتا تھا۔ ان میں اونٹ، ریچھ اور دیگر جانوروں کے اعضا فروخت ہوتے تھے۔ روز نامہ گارڈین کے مطابق دوکانوں پر فرخت ہونے والی فہرست میں بھیڑیے کے بچے، سنہری ٹڈے، بچھو، چوہے، گلہری، لومڑی، سیہہ، بجو، کچھوا اور مگر مچھ کا گوشت شامل تھا۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے چمگادڑیں اور پینگولین اس فہرست میں شامل نہیں تھے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ حالیہ برسوں میں ہمیں جن وائرسز کا پتہ چلا ہے وہ سب جنگلی حیات سے انسانوں میں منتقل ہوئے تھے چاہے وہ ایبولا ہو یا سارس اور اب کورونا وائرس۔

۲۔ چین کی تجارت کو تباہ کرنے کے لیے امریکہ نے کرونا وائرس تیار کیا ہے اور چین میں پھیلا دیا ہے۔ پچھلی کئی دہائیوں سے معاشی طور پر چین مضبوطی کی طرف گامزن ہے اور مختلف چیلنجز کو کامیابی کے ساتھ سنبھالتا رہا ہے تاہم چین نے جب سے اپنے سمندری اثر و رسوخ اور علاقائی توسیع (Territorial Expansion) کا آغاز کیا ہے تب سے امریکہ و چین کے مابین سرد جنگ کا ماحول ہے۔

انیسویں صدی میں مشہور برطانوی سیاستداں Halford John Mackinder نے کہا تھا کہ دنیا پر دھاک بٹھانے کے لیے علاقائی توسیع (Territorial Expansion) نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح بیسویں صدی کے اوائل میں مشہور امریکی مؤرخ Alfred Thayer Mahan نے کہا تھا کہ جس ملک کا کنٹرول سمندر پر ہوگا وہی دنیا پہ حکمرانی کرے گا۔ چین کے سوشل میڈیا پر یہ خیال عام ہے کہ کرونا وائرس امریکہ کی طرف سے چین پر ایک بڑا حملہ ہے اور اسے وسیع پیمانے پر ایک مشترکہ سازشی نظریہ بتایا جا رہا ہے۔

یہ کہا جا رہا ہے کہ Military World Games -2019 میں جن امریکی فوجیوں نے حصہ لیا تھا انھوں نے ووہان (Wuhan) کے Hunan Seafood Market میں وائرس پھیلا دیا۔ ان کا نعرہ تھا کہ ایک نئی قسم کی حیاتیاتی جنگ (Biological Warfare) آرہی ہے۔ لہٰذا چین کے ایک سوشل ایکٹیوسٹ نے چین میں ایک مستقل بائیو ڈیفنس فورس (Biodefense Force) کے قیام کا مطالبہ کیا ہے۔

اسی طرح 2002 میں عام ہونے والے سارس وائرس کے بارے میں بہت سارے چینی سائنسدانوں نے تسلیم کیا تھا کہ سارس (SARS) ایک حیاتیاتی ہتھیار (Biological Weapon) تھا جو امریکہ نے تیار کیا تھا۔ چین کے کچھ فوجی ماہرین نے امریکہ پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس نے ایوین فلو وائرس (Avian Flu Virus) کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور اس نے Antibiotic-Resistant Anthrax Strains تیار کر لیا ہے۔ ایک روسی سائنسدان نے اس وقت کہا تھا کہ سارس کے اندر خسرہ (Measles) اور ممپس (Mumps) کا مرکب ہے جسے صرف لیب ہی میں بنایا جاسکتا ہے۔ US Centres for Disease Control and Prevention (US CDCP) کے مطابق سارس کے متاثرین میں 58 فیصد گورے اور 32 فیصد ایشیائی افراد تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ بائیو ٹیررزم (Bioterrorism) میں بہت پہلے سے متحرک اور فعال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1960 میں ہارورڈ یونیورسٹی کے مشہور ماہر حیاتیات (Biologist) میتھو میسلسن (Mathew Meselson) نے حیاتیاتی ہتھیار کے خلاف امریکہ میں ایک کامیاب تحریک چلائی تھی۔

1969 میں امریکہ نے اس بین الاقوامی معاہدہ سے اتفاق کیا تھا جسے Biological Weapons BWC-Convention کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدے میں حیاتیاتی ہتھیار کی نشوونما اور ذخیرہ اندوزی کو ممنوع قرار دیا گیا تھا اور اس کے متعلقہ عناصر کی ترسیل وتجارت پر پابندی لگائی گئی تھی۔

اس معاملے پر امریکی نقطہء نظر کی وضاحت کرتے ہوئے صدر رچرڈ نکسن نے کہا تھا کہ ہم کبھی بھی جراثیمی ہتھیار استعمال نہیں کریں گے لیکن اگر ہمارے خلاف کوئی اسے کرے گا تو ہم اس کا بھرپور جواب دیں گے۔

2001 میں جارج واکر بش انتظامیہ نے Biological BWC-Weapons Convention کے مجوزہ پروٹوکول کو مسترد کر دیا تھا اور یہ وجہ بتائی تھی کہ یہ پروٹوکول زمینی سطح پر اس مقصد کے لیے ناکافی ہے۔ اس انکار نے چینی ماہرین کے اس شبہ کو یقین میں تبدیل کر دیا تھا کہ امریکہ حیاتیاتی ہتھیار کی تیاری میں مصروف ہے۔

2007 میں چین کے کچھ فوجی محققین نے ایک مضمون شائع کیا جس میں امریکہ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ مختلف قسم کے حیاتیاتی ایجنٹس سے نئے قسم کا حیاتیاتی ہتھیار تیار کر رہا ہے اور اس کیلئے متعدد ٹکنالوجی بروئے کار لا رہا ہے۔ ان محققین نے یہ الزام بھی لگایا تھا کہ واشنگٹن کے دفاتر پر ہوئے حملہ میں جو انتھراکس پائے گئے تھے وہ امریکہ کی ملیٹری لیب سے آئے تھے۔

2008 میں جب H5H1 برڈ فلو ایک بڑا مسئلہ بن گیا تھا اس وقت انڈونیشیا کے وزیر صحت سیتی سپاری (Siti Supari) نے امریکہ پر حیاتیاتی ہتھیاروں کو تیار کرنے کے لیے وائرس ایجنٹس استعمال کرنے کا الزام لگایا تھا اور جکارتہ میں جاری امریکی بحریہ کے میڈیکل ریسرچ یونٹ کے آپریشن کو معطل کر دیا تھا۔

۳۔ کرونا وائرس چین کے حیاتیاتی لیب کا ایک حادثہ ہے۔ اس کو بایوسیفٹی حادثے (Biosafety Accident) کے طور دیکھا جا رہا ہے کہ کرونا وائرس لیب ریسرچ کے دوران لیب سے باہر آ گیا اور سائنسداں اس کے درست پروٹوکول پر عمل نہیں کر سکے۔ ووہان انسٹی ٹیوٹ آف وائرولوجی میں چین کا سب سے بڑا بایوسیفٹی سینٹر BSL-4 بھی شامل ہے۔ اس کے محققین میں ایک نام شی زینگلی (Shi Zhengli) کا ہے۔ شی زینگلی نے اپنا

نام Batwoman رکھا ہوا ہے۔اس نے چمگادڑ اور دیگر ایجنٹس سے کرونا وائرس تیار کیا ہے۔لیکن شی زینگلی نے اس الزام کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ قدرت لوگوں کی غیر مہذب زندگی کی وجہ سے ان کو سزا دے رہی ہے۔

چینی حکومت نے ووہان انسٹی ٹیوٹ آف وائرولوجی کے BSL-4 کے ہیڈ کو تبدیل کر دیا ہے۔اب چن وی (Chen Wei) کو BSL-4 کا نیا سربراہ مقرر کیا گیا ہے۔چن وی چین کا سب سے ماہر بایووارفیئر ہے۔اس نئی تقرری نے اس شبہ کو گہرا کر دیا ہے کہ Wuhan Institute of Virology کا BSL-4 ہی وہ مرکز ہے جہاں سے کرونا وائرس لیک ہوا۔

14 فروری 2020 کو چینی صدر شی چن پنگ (Xi Jinping) نے اپنی قومی سلامتی کے لیے بایوسیکورٹی اور بایوسیفٹی کی ضرورت پر روشنی ڈالی۔جیفانگ ڈیلی (Jiefang Daily) سے منسلک ویب سائٹ پر ایک پوسٹ شائع ہوا۔اس کے مطابق چند امریکی CDC ماہرین جاسوسی کے لیے ایک فوجی مشن پر آسکتے ہیں تا کہ وہ وائرولوجی (Virology) میں چین کی صحیح صلاحیت کا اندازہ لگاسکیں۔

فروری 2020 میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن WHO کا ایک وفد چین کے دورے پر آیا تھا۔ اس وفد میں امریکہ کے دو ماہرین بھی شامل تھے۔لیکن یہ وفد ووہان کے وائرولوجی انسٹی ٹیوٹ (Wuhan Institute of Virology) نہیں جاسکا۔

حیاتیاتی ہتھیار کی دنیا میں چین کافی تاخیر سے میدان میں آیا۔دوسری جنگِ عظیم میں جاپان نے یونٹ 731 پروگرام میں دس ہزار سے زائد قیدیوں پر حیاتیاتی ہتھیار کے تجربات کئے۔تیس ہزار سائنسدانوں نے وسیع پیمانے پر انسانی جانوں سے کھیلنے کا ایسا مظاہرہ کیا کہ تاریخِ انسانی ہی شرما جاتی ہے۔ چوہوں پر کئے گئے کامیاب تجربات بعد ازاں چانگٹے شہر میں دس ہزار چینی باشندوں کی موت پر انجام پذیر ہوئے۔

ان حالات نے اس وقت کے چینی وزیر اعظم چاؤ انلائی (Zhou Enlai) کو پریشان کر دیا اور 1951 میں اس نے Academy of Military Medical Science-AMMS قائم کیا۔

2014 میں AMMS نے چین کی دواساز کمپنیوں کے ساتھ مل کر ایبولا وائرس (Ebola Virus) کا اینٹی تیار کیا تھا۔1990 کی دہائی میں چین کے سرکاری ذرائع نے اطلاع دی کہ چینی سائنسدانوں نے نادر زمین (Rare Earth) کو ایک میڈیم کے طور پر استعمال کیا جس میں بہت تیزی سے بروسیلوسس (Brucellosis) کاشت کی جا سکتی تھی۔ بروسیلوسس ایک موزوں حیاتیاتی ایجنٹ ہے۔

وائرس کے کئی حادثے چین میں حالیہ دنوں میں رونما ہوئے۔مثال کے طور پر دسمبر 2019 میں Lanzhou Veterinary Research Institute میں کام کرنے والے 65 افراد بروسیلوسس (Brucellosis) سے متاثر ہو گئے تھے۔

جنوری 2020 میں مشہور چینی سائنسداں لینگ (Li Ning) کو بارہ سال قید کی سزا سنائی گئی کیونکہ وہ مقامی مارکیٹ میں تجربات شدہ جانور فروخت کر رہا تھا۔

درج بالا تفصیلات کے مختلف جہات اس بات کو بتاتے ہیں کہ کرونا وائرس حیاتیاتی جنگ کا ایک نیا عنوان ہے۔اگرچہ حقائق اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ وائرس غلطی سے ووہان لیب سے لیک ہوا تاہم نمبر 2 اور نمبر 3 کی آراء ایک لحاظ سے مشترک اور وہ یہ کہ دنیا حیاتیاتی ہتھیار کی دوڑ میں بدترین تحقیقات میں مصروف ہے۔دجالیت اور حیوانیت کا عفریت انسانیت کو نگل رہا ہے۔موجودہ حالات اہل ایمان سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ظاہری نظافت کے ساتھ باطنی طہارت سے اپنے آپ کی حفاظت کریں۔

# ایک راز ہے کورونا وائرس کی پیدائش

مراق مرزا

وبائی امراض کا تعلق اس کرۂ ارض سے بے حد قدیم ہے۔ ماضی قریب میں ٹی بی، طاعون، چیچک اور ہیضہ جیسی متعدی مہلک بیماریاں بھی وبا ہی کے زمرے میں آتی تھیں جن پر اب بہت حد تک قابو پالیا گیا ہے۔ انسان کتنا ہی ترقی کیوں نہ کرلے، قدرت کی طاقت کے آگے وہ ہمیشہ ہی مجبور و معذور رہا ہے۔ وبائیں یوں ہی نہیں آتیں، دیگر قدرتی آلام و آفات کی طرح وباؤں کے ذریعے بھی رب عظیم حیات و کائنات پر اپنی مکمل گرفت کے اشارے دیتا ہے اور بنی آدم کو اس کی حیثیت سے آگاہ کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کورونا وائرس کے قہر کے سامنے آج پوری دنیا بے بس اور لاچار نظر آرہی ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کی حالیہ رپورٹ کے مطابق کورونا وائرس دنیا کے تقریباً ۱۰۰ مما لک میں پھیل چکا ہے اور ۹۲ ملکوں میں اس جان لیوا بیماری کی تشخیص ہوچکی ہے۔ اس کی نئی قسم کووڈ-۱۹ سے دنیا بھر میں اب تک ۴ ہزار سے زائد لوگ لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ اس وائرس سے متاثرہ مریضوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بتائی جارہی ہے۔ چین میں پیدا ہونے والے اس وائرس نے انگلینڈ سے لے کر امریکہ اور اٹلی سے لے کر ایران تک، دنیا کے تمام بڑے شہروں اور ملکوں میں افراتفری مچادی ہے اور اب اس نے ہندوستان میں بھی اپنے پیر پسار لیے ہیں۔ دلّی، ممبئی، آگرہ، جے پور، جموں اور لداخ کے علاوہ تمل ناڈو اور کیرالہ کے متعدد علاقوں سے بھی اس وائرس سے متاثرہ مریضوں سے متعلق خبریں آرہی ہیں۔ اس مہلک وائرس کے سبب پورے ملک میں خوف و ہراس کا ماحول ہے۔ سبھی بڑے شہروں میں اس کی روک تھام کے لیے خاطر خواہ انتظامات کیے جارہے ہیں۔ اس دوران وزیر اعظم نے ایک بیان میں عام لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ وہ اس وبا سے گھبرائیں نہیں اور افواہوں پر بھی دھیان نہ دیں، پوری صورت حال پر سرکار کی نظر ہے۔ اس وبا سے لڑنے کے لیے اور اس سے حفاظت کے لیے سبھی ضروری اقدامات کیے جارہے ہیں۔

اس وبا سے دنیا بھر کے ملکوں میں اموات کا سلسلہ جاری ہے۔ چین جہاں اس وبا کی شروعات ہوئی، وہاں اب تک ۳/ہزار سے زائد لوگ جان بحق ہوچکے ہیں جبکہ ۸۰/ہزار سے زائد افراد متاثر بتائے جارہے ہیں۔ چین کے علاوہ دیگر مما لک میں بھی کورونا وائرس کی وجہ سے اموات واقع ہوچکی ہیں۔ اٹلی، ایران اور جنوبی کوریا سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ ایران میں اس وائرس کی شدت بڑھتی جارہی ہے اور اس کے سبب ہلاکتیں بھی بڑھتی جارہی ہیں۔ یوروپی مما لک کی بات کریں تو اٹلی اس وائرس کے حملے سے بری طرح متاثر ہے جہاں ۲۴/گھنٹے میں ۱۶۸/مریضوں کے جان گنوانے سے ہر طرف ہاہا کار مچ گیا۔ اٹلی میں اس وائرس کے حملے سے مرنے والوں کی تعداد ۶۰۰ سے زائد ہوچکی ہے۔ اسی طرح جنوبی کوریا میں اب تک ۵۰ سے زائد لوگ موت کی آغوش میں جاچکے ہیں جبکہ تقریباً ۸ ہزار افراد متاثر بتائے جارہے ہیں۔ امریکہ میں ۳۱/لوگ اس وبا کی زد میں آکر موت کی نیند سوچکے ہیں۔ کورونا سے متاثرین کی تعداد یہاں ایک ہزار سے زائد ہے۔ امریکہ میں کورونا وائرس سے لڑنے کے لیے صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے ۸/ارب ۳۰/کروڑ کے بل کو منظوری دی ہے۔ یہ رقم وائرس سے متاثرہ مریضوں کی دیکھ بھال اور ان کے علاج پر خرچ کی جائے گی۔

ہر چند کہ پوری دنیا میں ڈاکٹروں کی الگ الگ ٹیمیں اس

وائرس کا علاج ڈھونڈنے میں لگے ہوئی ہیں مگر اب تک انہیں کامیابی نہیں ملی ہے۔ وہ بس اتنا کر پا رہے ہیں کہ اس وائرس سے متاثرہ مریضوں کی اپنی بساط بھر ٹریٹمنٹ کر رہے ہیں لیکن اس وبا کا اطمینان بخش علاج اب تک ڈھونڈا نہیں جا سکا ہے۔ یہ وائرس جتنا خطرناک ہے، اتنا ہی گہرا اس کا راز ہے۔ اس کے راز سے پردہ ہٹانے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ کب، کہاں اور کن حالات میں وجود میں آیا۔

کورونا وائرس کی بنیادی کہانی چین کے شہر ووہان کی ایک لیب سے جڑی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی لیب میں ریسرچ کر رہے ایک سائنس داں نے ایک عجیب سا وائرس دیکھا۔ ایسا وائرس میڈیکل کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس کی جینیاتی ترتیب کے مشاہدے سے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا تعلق چمگادڑ کی نسل سے ہوسکتا ہے۔ سائنس داں حیران تھے، کیونکہ وہ اس وائرس میں 'سارز' نامی وائرس کا عکس دیکھ رہے تھے جس کے سبب ۲۰۰۲ اور ۲۰۰۳ء میں چین میں ایک خطرناک وبا پھیلی تھی اور اس وبا کی زد میں آکر دنیا بھر میں ۷۷۴ لوگ مارے گئے تھے۔ اس وقت یہ بتایا گیا تھا کہ 'سارز' کسی شخص کے کھانسنے اور چھولینے سے پھیلتا ہے مگر اس وائرس کی اصل وجہ کچھ اور تھی جسے چین نے دنیا کے سامنے آنے نہیں دیا۔

دسمبر ۲۰۱۹ء کے ابتدائی ہفتے میں ووہان کے مچھلی بازار کے آس پاس رہنے والے کچھ لوگ اچانک بخار میں مبتلا ہو کر ہسپتال آئے۔ ان کا بخار عام بخار سے کچھ الگ تھا۔ لہٰذا ان کی طبی جانچ کے لیے ان کے خون کا نمونہ ووہان انسٹی ٹیوٹ آف وائرالوجی کے پاس بھیج دیا گیا جس کی جانچ کر کے ڈاکٹر لی ونلیاگ نے بتایا کہ یہ کسی آنے والی بڑی مہاماری کا اشارہ ہے۔ افراتفری سے بچنے کے لیے ڈاکٹر لی ونلیانگ کی رپورٹ کو چینی سرکار نے دبا دیا لیکن ڈاکٹر ونلیانگ اس وائرس کی تشخیص سے بے حد پریشان تھے۔ مچھلی بازار کے علاقے سے آئے سبھی مریضوں کو دیکھ کر انہیں احساس ہوگیا کہ وہ سب کے سب کسی انجانے خطرناک وائرس کا شکار ہیں۔ اس فکری اضطراب کے دوران انھوں نے یہ بات اپنے ڈاکٹر دوستوں سے وہاٹس ایپ گروپ میں شیئر کردی۔ کچھ دنوں بعد یہ خبر آئی کہ وہ خود کورونا وائرس کا شکار ہو کر اس دنیا سے چل بسے۔

ڈاکٹر لی ونلیانگ کی موت کورونا وائرس سے ہوئی یا کورونا وائرس کا راز فاش کرنے کے جرم میں چینی سرکار نے انہیں وادیٔ اجل میں بھیج دیا، یہ اب تک سوال ہی بنا ہوا ہے، جس کا جواب شاید کبھی نہیں ملے گا لیکن چین کے سرکاری ساؤتھ چائنا یونیورسٹی آف ٹکنالوجی کے دو سائنس دانوں بوتاؤ شاؤ اور لی شاؤ نے اپنے ایک دعوے سے دنیا کو چونکا دیا ہے۔ ان دونوں کا کہنا ہے کہ کورونا وائرس ووہان کی سی فوڈ مارکیٹ سے نہیں بلکہ چین کے سرکاری لیب سے پھیلا ہے جہاں بہت سارے جانور بشمول چمگادڑ پالے جا رہے تھے اور ان پر ریسرچ ہو رہی تھی۔ ان سائنس دانوں کے مطابق ریسرچ کے دوران ایک چمگادڑ نے ایک ڈاکٹر پر حملہ کردیا جس سے ڈاکٹر کی گردن پر خراش آگئی اور چمگادڑ کا ناخن بھی زخمی ہوگیا۔ اس طرح چمگادڑ کے خون کا چھوٹا سا قطرہ ڈاکٹر کے خون سے ضم ہوگیا۔ اس کے بعد یہ وائرس پھیلنا شروع ہوا۔

کورونا وائرس پر ایک امریکی سینٹ ٹام کاٹن نے ایک دھماکے دار بیان دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کورونا وائرس ووہان انسٹی ٹیوٹ آف بایولوجی سے باہر آیا ہے جو انسانوں کے ذریعہ تیار کیا جانے والا کوئی حیاتیاتی ہتھیار بھی ہوسکتا ہے اور اب چین اس کی پردہ پوشی کر رہا ہے۔ چین کو چیلنج کرتے ہوئے ٹام کاٹن نے مزید کہا کہ میری بات اگر غلط ہے تو چین یہ ثابت کرے کہ کورونا وائرس اس کے لیب سے نہیں بلکہ ووہان کے مچھلی بازار سے پھیلا ہے۔ دوسری طرف یورپی تنظیم برائے تعاون و تحفظ کے سابق ترجمان اور بین الاقوامی واقعات کے تجزیہ کار مائیکل باشی ارکی نے بھی کورونا وائرس کے بارے میں پہلی بار دنیا کو آگاہ کرنے والے ڈاکٹر لی ونلیانگ کی موت پر شک کا اظہار کیا ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ ڈاکٹر ونلیانگ کو کورونا وائرس کے بارے میں اطلاع شیئر کرنے کی سزا ملی ہے۔ ان تمام شکوک و شبہات اور غیر تصدیق شدہ دعوؤں کے پیش نظر کورونا وائرس کا سچ ایک گہرا راز ہی نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم خان

جنگل راج میں امن و امان اس لیے نہیں ہوتا کہ وہاں بھیڑیئے نہیں پائے جاتے بلکہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان کے دل میں شیر کا خوف ہوتا ہے۔ بھیڑیوں کو اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ اگر وہ خرگوش پر دست درازی کریں گے تو شیر سزا دے گا۔ یہ ڈر ختم ہوجائے تو جنگل میں بھی دہلی کی مانند دنگا فساد ہونے لگے۔ دہلی کے فساد کی ویسے تو کئی وجوہات ہیں لیکن سب سے اہم یہ ہے کہ شیر خرگوش کے بجائے بھیڑیوں کا ہمنوا بن گیا ہے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ وہ کمزور ہوگیا ہے۔ جمہوری نظام نے اسے اقتدار میں رہنے کے لیے جانوروں کی حمایت کا محتاج بنا دیا ہے۔ اس نے اپنی مقبولیت کا انحصار بھیڑیوں پر کرلیا ہے۔ وہ انہیں درندگی کی سزا دینے کے بجائے نہ صرف تحفظ فراہم کرتا ہے بلکہ انعام و اکرام سے بھی نوازتا ہے۔ بھیڑیئے کا انعام یہ ہے کہ اسے قتل و غارتگری کا مواقع عطا کیے جائیں۔ خون خرابے کی کھلی چھوٹ دینے کے بعد اس کی ہر طرح سے حفاظت کی جائے۔ ایسے میں بھیڑیوں کی درندگی شرافت کے خول سے باہر آجاتی ہے اور بستی و بیاباں میں فساد برپا ہوجاتا ہے۔

یہ بات اب شک شبہ سے بالاتر ہے کہ دہلی کے حالیہ فسادات کی ابتداء کپل مشرا کی اشتعال انگیزی سے ہوئی۔ اس حقیقت کا بلواسطہ اعتراف دہلی کے بی جے پی رکن پارلیمان گوتم گمبھیر نے واضح الفاظ میں نام لے کر کیا ہے۔ ان کے مطابق نفرت پھیلانے والا جو کوئی بھی ہو، چاہے وہ کپل مشرا ہوں یا کوئی اور ان کے خلاف سخت ترین کارروائی کی جانی چاہئے۔ ہر اشتعال انگیز خطیب کے خلاف کارروائی ہونی چاہئے۔ ایسے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ، یک رکن پارلیمان کے مطالبے کے باوجود اس کی اپنی برسرِ اقتدار جماعت آخر یہ کارروائی کیوں

نہیں کرتی؟ اب تو معاملہ تقریر سے آگے نکل گیا ہے۔ ۴۲ لوگوں کی ہلاکت کے بعد بھی فسادی جئے شری رام کا نعرہ لگاتے ہوئے گھوم رہے ہیں۔ ان پر کوئی کارروائی نہیں ہو رہی ہے اس لیے یہ بیان بازی محض مگر مچھ کے آنسو ہیں۔ گوتم گمبھیر اگر اپنے گھر سے نکل کر فساد زدہ علاقوں میں چلے جائیں تو کیا مجال ہے کہ قتل و غارتگری نہ رکے لیکن ایسا کوئی کرنا نہیں چاہتا اس لیے کہ جن بھیڑیوں کی مدد سے پچھلا انتخاب جیتا ہے اور آئندہ پھر سے جیتنا ہے ان کی ناراضگی کا خطرہ بھلا کون لے سکتا ہے؟

ہمارے سیاستدانوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اشتعال انگیز بیانات کو بھی انتخابی ترازو میں رکھ کر تولتے ہیں یعنی اگر اس سے سیاسی فائدہ حاصل ہو تو وہ نہ صرف مباح بلکہ مستحب ہے اور اگر نقصان ہو جائے تو مسترد کیے جانے کے قابل ہے۔ یعنی اگر اس اشتعال انگیزی کے بعد بی جے پی دہلی کے انتخاب میں کامیاب ہو جاتی اور منوج تیواری وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف لے لیتے تو وہ اس کی مذمت نہیں کرتے لیکن چونکہ ناکامی ہاتھ لگی اس لیے اب وہ خراب ہو گئی۔ ان سیاستدانوں کے نزدیک انسانی جان و مال اور عزت و آبرو ثانوی حیثیت کے حامل ہیں اس لیے وہ اس کو دنگا فساد سے جوڑنے کے بجائے انتخابی نتائج کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ دہلی میں بی جے پی اکائی کے صدر اور وزیر مملکت برائے خزانہ منوج تیواری نے کپل مشرا کی مذمت اس لیے نہیں کی کہ اس کے سبب دہلی میں خاک و خون کا ننگا ناچ شروع ہو گیا بلکہ انہیں افسوس لیئے ہے وہ دہلی کے تخت سے محروم رہ گئے ہیں۔ منوج تیواری کا مکمل بیان اس امر کی تصدیق کرتا ہے۔

ایک اور افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ انڈین ایکپریس جیسے سنجیدہ اور بے باک اخبار کو بھی آزمائش کی اس نازک گھڑی میں فساد کی وجوہات معلوم کرنے سے زیادہ دلچسپی انتخابی نتائج میں ناکامی کی وجہ جاننے میں ہے۔ اس لیے دہلی بی جے پی کے سربراہ منوج تیواری کو کہنا پڑا کہ فرقہ وارانہ تقریروں سے بھارتیہ جنتا پارٹی کو دہلی انتخابات میں بہت نقصان ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے موقف کی وضاحت کے لیے اشتعال انگیزی کرنے والے انوراگ ٹھاکر، پرویش ورما، پرکاش جاوڈیکر اور یوگی آدتیہ ناتھ جیسے پارٹی رہنماؤں کا نام لے کر کہا کہ، ''تناظر کوئی بھی ہو حقیقت یہ ہے نفرت انگیز تقاریر ہماری شکست کا سبب بنیں۔ ہم نے ان تقریروں کی پہلے بھی مذمت کی اور آج بھی کرتے ہیں''۔ اس فہرست میں ایک نام چھوٹ گیا تھا تو اسے جوڑ کر وہ بولے ''چاہے وہ پارٹی کے ساتھی کپل مشرا ہی کیوں نہ ہوں جنھوں نے دسمبر میں سی اے اے کے حامی ریلی میں ''دیش کے غداروں کو گولی مارو سالوں کو'' کا نعرہ لگایا تھا۔ ایسے لوگوں کو اس خطا کی سزا ملنی چاہیے''۔

منوج تیواری نے اپنے بیان میں پارٹی کے بڑے رہنماؤں کا نام لے کر بڑی جرأتمندی کا ثبوت تو دے دیا اور یہ ممکن بھی ہے کہ کپل مشرا جیسے چھُٹ بھیا کو بلی کا بکرا بنا دیا جائے لیکن انوراگ ٹھاکر اور پرویش ورما جیسے ارکان پارلیمان کے خلاف کسی کارروائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کی جو لوگ سادھوی پرگیا ٹھاکر کو اس کے گوڈسے کی کھلے عام حمایت کی سزا نہیں دے سکے وہ بھلا انوراگ ٹھاکر کا کیا بگاڑ لیں گے۔ پرکاش جاوڈیکر پر نظر بد ڈال کر سنگھ کو ناراض کرنے کا بھی تصور محال ہے۔ یوگی آدتیہ ناتھ کو تو اشتعال انگیزی کی خاطر بلایا ہی جاتا ہے۔ ان کو اگر اس کام سے منع کر دیا جائے تو وہ کسی کام کے نہیں رہ جاتے۔ اس لیے منوج تیواری کا بیان اخبارات اور ٹیلی ویژن کی زینت کا سامان ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

دنیا کی عظیم ترین جمہوریت امریکہ کی تاریخ گواہ ہے کہ اس نظام میں ریپبلکن پارٹی ہو یا ڈیموکریٹس ہوں، وہ اپنے لیڈر کو سزا دینا تو دور مواخذے سے بھی بچا لیتے ہیں اور ہندوستان کے اندر نہ صرف بی جے پی بلکہ کانگریس بھی گھناونے سے گھناؤنے جرم میں ملوث اپنے رہنماؤں کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچاتی۔ تفریق و امتیاز سے بالاتر ہو کر سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کے الفاظ کا استعمال یا تو منشور کی حد تک ہوتا ہے یا کبھی کبھار تقریر و انٹرویو میں

ہو جاتا ہے۔ عملی زندگی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور اس منافقت کو معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ فی الحال دہلی کے اندر ان بیانات کے سبب فساد پھوٹ پڑا ہے۔ اس لیے انصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ مذکورہ بالا رہنماوں کو قتل و غارتگری کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان پر مقدمہ درج کیا جائے نیز ان کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

منوج تیواری قابلِ مبارکباد ہیں جو انہوں نے کم از کم اتنا کہا تو سہی کہ ''میں چاہتا ہوں کہ ایسی نفرت انگیز تقاریر کرنے والوں کو ہمیشہ کے لئے (سیاست کی دنیا سے) نکال دیا جائے''۔ اس بیان کی اہمیت اس کی ابدیت میں ہے۔ عام طور پر سیاسی جماعتیں ۶ سال کے لیے کسی رکن کو پارٹی سے نکالتی ہیں اور درمیان میں انہیں خاموشی کے ساتھ جماعت میں شامل کرلیا جاتا ہے جس سے یہ تعذیب بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ تیواری کا کہنا ہے کہ '' آیئے ہم ایک ایسا نظام وضع کریں جہاں نفرت انگیز تقاریر کرنے والوں کو انتخابات لڑنے کے حق سے محروم کر دیا جائے''۔ تیواری نے یقین دلایا ہے کہ ''اگر اس طرح کے نظام کو قائم کیا جاتا ہے تو میں انفرادی اور پارٹی صدر کی حیثیت سے اس کی حمایت کروں گا''۔ منوج تیواری شاید اس حقیقت سے واقف ہیں کہ نہ تو نومن تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی اس لیے اچھی اچھی باتیں کر کے نیک نامی حاصل کرنے میں کیا حرج ہے۔ تیواری اگر نفرت کو محبت میں بدلنا ہی چاہتے ہیں تو انہیں فساد زدہ علاقہ کا دورہ کر کے مصیبت زدگان کے آنسو پونچھنا چاہیے۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہیے ورنہ اس بول بچن کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

شاید یہ پہلی بار ہے کہ سنگھ پریوار کسی شرجیل امام کو ایجاد کر کے اسے فساد کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکا۔ ہندو اور مسلمان فساد زدگان اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کپل مشرا کی لگائی ہوئی آگ ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ذرائع ابلاغ اس کو ماسٹر مائنڈ قرار دے کر نت نئی کہانیاں بنانے سے گریز کر رہا ہے۔ مصطفیٰ آباد کا باشندہ شاہد خان رکشا چلاتا تھا۔ وہ پیٹ میں گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ اس کے بھائی عمران نے بتایا ''ہم لوگ ۶ سال قبل بلند شہر سے دہلی میں رہنے کے لیے آئے تھے مگر کبھی ایسا فساد نہیں دیکھا۔ یہ سب کپل شرما کی اشتعال انگیزی کے سبب ہوا''۔ اس فساد میں فوت ہونے والے راہل سولنکی کے والد ہری سنگھ سولنکی اور دیگر رشتے داروں نے بھی کپل مشرا کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے کہا ''اگر اسے نہیں روکا گیا تو لوگ اپنے بچوں کو گنواتے رہیں گے۔ اس کو (کپل مشرا) فوراً گرفتار کیا جانا چاہیئے''۔ اس فساد سے متاثر ہونے والا ہر خاص و عام بلاتفریق مذہب و ملت چونکہ کپل مشرا کو موردِ الزام ٹھہرا کر اس کی گرفتاری کا مطالبہ کر رہا ہے اس لیے فوراً سے پیشتر اس کی گرفتاری عمل میں آنی چاہیے۔ فساد پر قابو پانے کا یہ بہترین طریقہ ہے کیونکہ جب شرپسندوں کو پتہ چلے گا کہ ان کا آقا گرفتار ہو چکا ہے تو وہ بزدل خود ہی اپنے بلِ میں دُبک جائیں گے۔ قانون کی بالادستی اور اس کی پامالی کے عوض سزا کا خوف امن قائم کرنے کے لیے لازمی ہے۔

# ملکی قوانین میں مذہبی تفریق کا بڑھتادائرہ

محمد صبغۃ اللہ ندوی

شہریت ترمیمی قانون پر پورے ملک میں بحث چل رہی ہے ،سیاست بھی خوب ہورہی ہے۔کوئی اس کے خلاف احتجاج ومظاہرہ کررہاہےتوکوئی اس کے حق میں مہم چلارہاہے۔ ہرایک کی اپنی اپنی سوچ اورنظریہ ہے جودوسرے سے میل نہیں کھاتا اس لئے دوسراغلط سمجھتاہے۔ حقیقت نہ توچھپ سکتی اورنہ بدل سکتی ہے ۔شہریت ترمیمی قانون مذہبی تفریق پر مبنی ہے۔ مذہب کی بنیاد پرشہریت دینے کا قانون ان لوگوں نے بنایا جو یہ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ مذہب کی بنیاد پرمسلمانوں کوریزرویشن نہیں دیا جاسکتا اورآج کہہ رہے ہیں کہ مذہب کی بنیاد پر دوسروں کوشہریت دی جاسکتی ہے لیکن مسلمانوں کونہیں بالکل دلت ریزرویشن کی طرح جس مذہب کی بنیاد پرہندوؤں ،بودھوں ،جینیوں اورسکھوں کوریزرویشن تو دیا جاتا ہے لیکن اسی مذہب کی بنیاد پرمسلمانوں اورعیسائیوں کونہیں دیا جاسکتا ۔کہنے کوضرور دلت ریزرویشن کی بنیاد پسماندگی ہے لیکن اس کی بنیادی شرط مذہب ہے۔اسی طرح پاکستان ،بنگلہ دیش اورافغانستان سے آئے غیرملکی پناہ گزینوں کوشہریت دینے کی بنیادی شرط مذہب ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جوکسی کی زبان پرنہیں آتی لیکن عملاً اسی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ایک سیکولر اورجمہوری ملک میں مذہب کی شرط یا مذہبی تفریق کی پالیسی کی گنجائش کہاں سے اورکیسے نکالی جارہی ہے؟بات صرف دلت ریزرویشن اورشہریت ترمیمی قانون کی نہیں بلکہ اوربھی کئی قوانین بنائے گئے جومذہبی تفریق پر مبنی ہیں جن کی بات نہ لوگ کررہے ہیں اورنہ میڈیااورسول سوسائٹی کے لوگ اٹھارہے ہیں ،سرکارنے یہ قوانین خاموشی سے بنادیئے کہ پتہ نہیں ہے جبکہ وہ بھی شہریت ترمیمی قانون کی طرح ہیں جیسےطویل مدتی ویزا کاجوقانون موجودہ سرکارنے بنایااس سے مسلمانوں کوباہررکھا گیااسی طرح فیماایکٹ کے تحت نہ کوئی مسلم پاکستانی یا بنگلہ دیشی این آراواکاؤنٹ کھول سکتاہے اورنہ رہائشی زمین خرید سکتا ہے ۔ویزا جرمانہ یا پنالٹی کا قانون بنا یا گیا وہ مذہبی تفریق پر مبنی ہے ۔مسلمانوں اوردیگرکمیونٹی کے لوگوں پر جرمانے میں بہت فرق ہے ۔مسلمانوں کوزیادہ جرمانہ دنیا ہوگا اوردیگرکمیونٹی ہندو،سکھ،عیسائی ، بودھ ،جین اورپارسی وغیرہ کوکم ۔ویزاقانون کے مطابق اگرکوئی این آراومسلمان ایک سے 90 دنوں تک ہندوستان میں غیرقانونی طریقے رہتاہےتو 300 ڈالرجرمانہ جبکہ دیگرکمیونٹی کے لئے صرف 100 روپئے ہوگا۔91 دنوں سے دوسال تک رکنے پرمسلمانوں کو 400 ڈالراورباقی کمیونٹی کےلوگوں کوصرف 200 روپئے دینے ہوں گے اوردوسال سے زیادہ دنوں تک رکنے پر باقی کمیونٹی کے لئے

300 روپئے اور مسلمانوں کے لئے جرمانہ 500 ڈالر ہے۔ جرمانہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے لئے ڈالر میں ہوگا جبکہ وہاں کی اقلیتی کمیونٹی کے لوگوں کے لئے روپئے میں وہ بھی بہت کم۔
آئین کی بنیاد اور روح سیکولرزم ہے۔ اس میں مذہب کی بنیاد پر شہریت دینے یا قانون بنانے کا التزام نہیں ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھایا جاتا رہا کہ مذہب کی بنیاد پر ان کو ریزرویشن نہیں دیا جاسکتا لیکن اب کہا جارہا ہے کہ مذہب کی بنیاد پر دوسروں کو شہریت دی جاسکتی ہے لیکن مسلمانوں کو نہیں جیسا کہ شہریت ترمیمی قانون ہے۔ شہریت کے تعلق سے حکومت کی طرف سے ایک ہی رٹ لگائی جاتی ہے کہ یہ شہریت دینے کا قانون شہریت چھیننے کا نہیں اس لئے کسی کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ فرض کرلیں کہ صرف شہریت دینے کا قانون ہے شہریت چھیننے کا نہیں تو سوال یہ ہے کہ اس کی ضروت کیا تھی؟ کیا سابقہ قانون میں شہریت دینے کی گنجائش نہیں تھی؟ یا حکومت کو اس کا اختیار نہیں تھا کہ اس کو یہ قانون بنانے پر ضرورت پڑی؟ حکومت کی بات میں وزن اس لئے نہیں ہے کیونکہ ابھی 19 جنوری کو چنئی شہری منچ کے ایک پروگرام میں مرکزی وزیر مالیات نرملا سیتارمن نے انکشاف کیا تھا کہ گزشتہ چھ برسوں میں 2838 پاکستانیوں، 914 افغانوں اور 172 بنگلہ دیشیوں کو 1964 سے 2008 تک سری لنکا سے آئے 4 لاکھ تمل مہاجرین کو شہریت دی گئی۔ مطلب صاف ہے کہ نئے قانون سے پہلے بھی پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان، سری لنکا یا دوسرے ملکوں سے آئے لوگوں یا پناہ گزینوں کو شہریت دی جاتی رہی، آئین میں شہریت دینے کی گنجائش یا اختیار تھا اور ہر حکومت یہ کام آسانی سے اور اپنی صوابدید پر کرتی تھی۔ اس کی مخالفت اور سیاست نہیں ہوتی تھی۔ پھر مذکورہ قانون کی ضرورت کیا تھی؟ یہی لگتا ہے کہ اس قانون کے پیچھے حکومت کی نیت اور مقصد کچھ اور ہے جسے وہ بتانا نہیں چاہتی۔
شہریت ترمیمی قانون کے خلاف احتجاج ومظاہرے پر حکومت صرف یہی کہتی ہے کہ اپوزیشن پارٹیاں اور رہنما لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں اور تحریک چلانے کے لئے اکسا رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کہیں بھی اور کسی بھی احتجاج کی قیادت سیاسی رہنما نہیں کررہے ہیں صرف عوامی احتجاج اور دھرنا چل رہا ہے۔ اب تو پورے ملک میں وہ خواتین مظاہرہ کررہی ہیں جن کے ساتھ تین طلاق کے مسئلہ پر حکومت نے جھوٹی ہمدردی کا دکھاوا کیا تھا لیکن اب شاہین باغ، لکھنو کے گھنٹہ گھر یا ملک کے دیگر حصوں میں دھرنے پر بیٹھی خواتین کے ساتھ نہ ہمدردی ہے اور نہ ان کا درد یا پریشانی حکومت کو نظر آرہی ہے۔ شاہین باغ کا احتجاج ایک نقارۂ خدا بن کر پوری دنیا کی توجہ اپنی جانب مبذول کررہا ہے حکومت اس سے پریشان تو ہے لیکن نظر انداز کررہی ہے اور قانون کو وقار کا مسئلہ بنا کر ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کررہی ہے۔ قانون کے حق میں مہم چلا رہی ہے لیکن اس کے خلاف پرامن مہم چلانے والوں کے ساتھ بات چیت نہیں کررہی ہے بلکہ انتظامیہ کی طرف سے احتجاج کو کچلنے کی کوشش ہورہی ہے۔ اگر یہ قانون اتنا ضروری تھا تو آسام میں این آرسی کے بعد اور پورے ملک میں مجوزہ این پی آر اور این آرسی سے پہلے کیوں نہیں بنایا گیا؟ آسام میں این آرسی سے پہلے یا پورے ملک میں این آرسی کے بعد بنایا جاسکتا تھا لیکن پورے ملک میں این آرسی سے پہلے مذکورہ قانون کی رو سے لوگوں کو شہریت دینے کی کارروائی شروع ہوگئی تاکہ جب ملکی سطح پر این آرسی ہو تو آسام جیسی صورت حال نہ پیدا ہو۔ مسلمانوں سے تین گنا زیادہ غیر مسلم غیر ملکی درانداز یا ایک مخصوص فکر کے لوگوں کی اصطلاح میں گھس پیٹھیا نہ ثابت ہوں۔ شہریت ترمیمی قانون کے پیچھے کوئی نہ کوئی بدنیتی یا خطرناک ایجنڈا ضرور ہے جو حکومت سامنے نہیں لارہی ہے لیکن عوام سمجھ کر تحریک چلارہے ہیں۔ حکومت نے اگر چہ قانون کو مذہبی رنگ دے دیا لیکن اس کے خلاف عوامی تحریک کو مذہبی رنگ دینے اور اس کی آڑ میں فرقہ وارانہ سیاست کرنے میں کامیاب نہیں ہورہی ہے کیونکہ تحریک میں ہر مذہب اور کمیونٹی کے لوگ، طلبا، نوجوان اور تعلیم یافتہ لوگ شامل ہیں حکومت اپنے جال میں پھنس گئی ہے اور بوکھلاہٹ میں الٹے سیدھے بیانات دے رہی ہے۔

# عصر حاضر میں جدال احسن کی تعبیر

ڈاکٹر وقار انور

جدال احسن کا تذکرہ قران کریم کی سورۃ النحل کی آیت 125 میں آیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ ہم اس آیت پر ایک نگاہ ڈال لیں تا کہ اس اصطلاح کو صحیح تناظر میں سمجھ سکیں۔ درج ذیل پانچ نکات اس غرض کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں۔

الف اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ دیگر افراد کو اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دیں۔ اس سبیل رب کے علاوہ کسی اور غرض سے گفتگو اس آیت کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ البتہ کسی مثبت مقصد کے تحت گفت وشنید کے اخلاقی طریقوں کے لئے اس جگہ بیان کئے گئے اصولوں سے استفادہ مفید ہوگا۔ بہر حال آیت کا اپنا تناظر متعین ہے۔

ب دعوت کے اس فریضہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں پہلی تاکید حکمت کی ہے جس کا اطلاق اس بات پر ہوگا کہ کب' کیسے اور کتنی بات کی ترسیل کی جائے۔ بے ڈھنگے اور بھونڈے طریقہ سے بہت ساری باتیں، بے موقع اور مخاطب کی نفسیات' ذوق اور ذہنی سطح کا لحاظ کئے بغیر نہ کی جائیں۔

ج دوسری تاکید عمدہ نصیحت کی ہے۔ اس کا اطلاق اس بات پر ہوگا کہ کیا بات' کس انداز سے کی جائے؟ دعوت دینے والے کی زبان شیریں ہو' بات جو پہنچائی جا رہی ہے دل آویز ہو اور اور قلب خیر خواہی کے جذبہ سے معمور ہو۔ آں حضرت ﷺ کی احادیث اور سیرت میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ بخاری اور مسلم دونوں نے حضرت انس ؓ سے مروی یہ حدیث کی روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "یسروا ولا تعسروا' وبشروا ولا تنفروا"۔ مزید براں حضرت معاذ ؓ کو یمن روانہ کرتے وقت آپ ﷺ نے جو نصیحتیں کی تھیں' اور دعوت دینے کی جو ترتیب بیان کی تھی وہ سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے۔

د حکمت اور عمدہ نصیحت کے باوجود اس بات کا امکان موجود ہے کے مخاطب سے اختلاف ہو جائے اور بحث کا موقع آ جائے۔ ایسے موقع کے لئے اس آیت میں جدال احسن کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں شائستگی کا دامن اس وقت بھی نہ چھوٹے۔ دل دکھائے اور عزت نفس پر چوٹ پہنچائے بغیر اپنی بات مدلل طریقہ سے پیش کی جائے تا کہ افہام وتفہیم کا ماحول باقی رہے۔ ایک دفعہ اگر سخت' تند اور تلخ لہجہ تک گفتگو جا پہنچی تو دعوت کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ داعی کو ہمیشہ یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کے وہ سبیل رب کی دعوت کا فریضہ انجام دے رہا ہے اس لئے یہ اصل مقصد فوت نہ ہو جائے اور دل کا دروازہ کھلنے کے بجائے بند ہو جائے۔

ھ دلوں کا دروازہ کھول دینے کی ذمہ داری اللہ تعالی نے داعی کو نہیں دی ہے۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ انتہائی درست بات

درست طریقہ سے پہنچا دینے کے باوجود کوئی دل نہ پسیجے۔ دوسری طرف یہ بات بھی ممکن ہے کہ ایک سادہ سی سیدھی سچی بات کسی دل میں گھر کر جائے۔ اسی وجہ سے متذکرہ آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالی نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ وہ خود اس راہ پر چلنے اور نہیں چلنے والوں سے واقف ہے۔ بندوں کا کام نتائج سے بے پرواہو کر حکمت' اچھی نصیحت اور جدال احسن سے کام لینا ہے۔ اگر تمام تر حکمت عملی اور احتیاطی تدابیر کے باوجود نتیجہ حسب حال نہ نکلے تو اس کا مطلب اس طریقہ کار کی ناکامی نہیں ہے۔ بہر حال راہ عمل وہی ہوگا۔

اس طرح ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کے درج بالا پانچ نکات میں پہلے اور آخری کا تعلق اس کام کی روح سے ہے کہ دعوت کا یہ کام کس غرض سے کیا جائے اور اس کے نتیجہ کے سلسلہ میں کیا ذہن بنایا جائے۔ بیچ کے تین نکات کا تعلق کام کے طریقہ سے ہے یعنی اس کے جسم سے۔ اس طرح جسم و جان کا یہ تعلق استوار ہو جائے تو متذکرہ قرانی آیت کا منشاء پورا ہو جائے گا۔

ڈائیلاگ (Dialogue) : دور جدید میں درج بالا تصورات سے مماثل ایک دوسری اصطلاح ڈائیلاگ کا استعمال عام طور پر کیا جا رہا ہے۔' خصوصاً بین المذاہب ڈائیلاگ کا ذکر بہت ہو رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دونوں تصورات کا موازنہ کیا جائے تا کہ مشترک اجزاء اور متصادم عناصر کی نشاندہی کی جائے اور جدید دور کی خصوصی ضرورتوں کے تحت طریقہ کار کی وضاحت کی جائے۔ اس مضمون میں یہ کام پیش نظر ہے۔

ہم نے اوپر اپنی گفتگو میں جن مراحل کو جسم سے تعبیر کیا ہے ان سب کے مجموئے کو ڈائیلاگ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ جدال احسن سے زیادہ وسیع ہے۔ کیونکہ یہ حکمت اور عمدہ نصیحت پر بھی مشتمل ہے۔ البتہ اصل سوال پہلے نکتے یعنی اس پورے عمل کے مقصد سے ہے۔ مقصد اگر اللہ تعالی کے راستہ کی دعوت ہو تو یہ دونوں چیزیں ایک ہی ہیں۔ جسم اور روح دونوں ایک ہوں تو نام کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ڈائیلاگ کہیں یا حکمت' عمدہ نصیحت اور جدال احسن پر مشتمل عمل' کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

دور جدید میں ڈائیلاگ جن مقاصد کے لئے کئے جا رہے ہیں وہ عموماً مثبت ہیں۔ مثلاً غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے ایک دوسرے کے دین' تہذیب' تاریخ' روایات وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کرنا اور حاصل کرنا مفید کام ہیں۔ اکثر دوریاں غلط معلومات کا شاخسانہ ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے ایسے ڈائیلاگ مفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ مختلف مذاہب و مسلک کے حامل افراد کے درمیان فاصلوں کو دور کرنے اور تعلقات کو استوار کرنے میں مدد و معاون ہیں۔ البتہ اس کے مقصد میں اکثر وحدت ادیان کا بے تکا اور فاسد نظریہ در آتا ہے جس میں دو بنیادی نقائص ہیں۔ ایک یہ کے متضاد عقائد ایک ساتھ درست نہیں ہو سکتے ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ توحید' تثلیث اور شرک سب کو ایک ساتھ صحیح ہوں؟ دوسری خرابی اس ذہنیت میں ہے جس کے تحت اپنی شناخت کو ضم کئے بغیر محبت' یگانگت اور بامعنی ربط باہمی ممکن نہیں ہے۔

قران کریم میں درج بالا آیت کے علاوہ سورہ آل عمران آیت 64 میں اہل کتاب کو خطاب کر کے کلمہ سواء کی دعوت دی گئی ہے۔ اس مقام پر مقصد متفق علیہ باتوں کی تلاش کو توحید کا پیغام پہنچانے کی پہلی منزل کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

دور جدید میں مسلمانوں کی جانب سے ڈائیلاگ کی دو بنیادیں ہیں۔ ایک توحید ]وحدت رب[ اور دوسری وحدت بنی آدم۔ تصور توحید سے احساس ذمہ داری اور جوابدہی معاد کے سوتے پھوٹتے ہیں اور وحدت آدم ظلم کے ازالہ اور عدل کے قیام کی سعی کی جانب متوجہ کرتا ہے جس کی عملی صورت گری اسوہ رسول اللہؐ سے ہوتی ہے۔

ہم اپنی بات اس امر کے تذکرہ پر مکمل کریں گے کہ بامعنی ڈائیلاگ صرف اسٹیج پر ساتھ بیٹھنے (Stage Sharing) کا نام نہیں ہے۔ اگر اس کے نتیجہ میں قیام عدل کی سعی میں میدان کار میں شامل ہونے کا کام شروع نہ ہو تو یہ سب صرف علمی سرگرمیاں (Academic Exercises) ہوں گی۔ ایسی کھوکھلی کاوشیں بے سود اور اکثر ضرر رساں (counter productive) کہ رہ ہو جاتی ہیں۔

# انسان خدا کا شاہکار

معتصم سعد
(ایوت محل، مہاراشٹر)

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات بہت وسیع اور انتہائی خوبصورت بنائی ہے۔ بے شمار مخلوقات سے یہ دنیا مزین کی گئی ہے۔ یہیں پر ایک خاکی مخلوق بستی ہے جو کہ انسان ہے۔

انسانوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں پہلی وہ جو پیدا تو بہترین ساخت پر ہوتے ہیں، لیکن بعد میں برائیوں اور برے میلانات کی طرف مائل ہوجاتے ہیں اور اخلاقی پستی میں گرتے گرتے آخری انتہا تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس زوال میں مختلف عوامل جیسے کہ نفس کی پیروی، اپنی ذات کی ناقدری، ناشکری اور نفس امارہ کی غلامی شامل ہے۔ دوسرے وہ جو ایمان اور عمل صالح میں اپنے آپ کو اس طرح مشغول کر لیتے ہیں کہ اس گراوٹ سے بچ جاتے ہیں اور اس مقام پر رہتے ہیں جو ان کے بہترین ساخت ہونے کا لازمی تقاضہ ہے۔ انسان کی بہترین ساخت یہ ہے کہ اس کو وہ اعلیٰ درجہ کا جسم عطا کیا گیا جو کسی اور مخلوق کو نہیں دیا گیا ہے۔ انسان کے مختلف اعضاء کی ساخت اتنی پیچیدہ ہے کہ ان کی تفصیل بیان کرنے کے لیے گھنٹوں درکار ہیں۔ اس پر بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔

انسانوں کو فکر وفہم اور علم وعقل کی وہ بلند قابلیتیں بخشی گئیں ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشی گئیں۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، ص ۳۸۴)

یہ وہی بات ہے جس کے لیے سورہ التین میں قسم کھا کر فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ اگر انسان اپنی اصل اپنی فطرت پر قائم اور حقیقت سے واقف ہوجائے تو بہت اونچا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنی اصل سے ہٹ جائے اور بگڑ جائے تو اسفل السافلین جیسے شرمناک درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔ جب انسان اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو بدی کے راستوں میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے برائی کرنے کا موقع دے دیتا ہے۔

حرص، طمع، خودغرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن، غیظ وغضب اور ایسی ہی دوسری خصلتوں میں جو لوگ غرق ہوجاتے ہیں وہ اخلاقی حیثیت سے فی الواقع سب نیچوں سے نیچ ہوکر رہ جاتے ہیں۔

''وہ اللہ کو بھول جاتے ہیں تو اللہ انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیتا ہے۔'' (الرعد)

انسان جب اپنے اوپر غور وفکر کرتا ہے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ ایک مادی وجود ہے جو کہ اپنے اندر اخلاقی حس رکھتا ہے۔ یہ نفسیاتی وجود بہت اہمیت کا حامل ہے جس سے وہ خیر وشر کی تمیز کرتا ہے۔

یعنی انسان ایک مرکب وجود رکھتا ہے ایک سے زائد عوامل اس میں اثر انداز ہیں۔ اس کی سرشت میں فرشتہ کی صفات بھی کارفرما ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کا ایک نمونہ ہے اور ساتھ ہی وہ ایک حیوانی عنصر بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور اگر وہ اس عنصر کے ساتھ کام کرے اور اپنی فطرت کے خلاف عمل کرے تو وہ درندگی کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر فحاشی اور عریانیت پر اتر آئے تو بے حیائی میں جانوروں کو بھی مات دے بیٹھتا ہے اگر ظلم پر اتر آتا ہے تو خوں خوار درندے اس کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ اگر جنگ لڑنے پر آتا ہے تو ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، نائٹروجن بم کے استعمال میں بھی دریغ نہیں کرتا اور ہم ہیروشما اور ناگاسا کی جیسے حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان اور دوسرے جانوروں کے درمیان بظاہر اور کوئی فرق نہیں رکھا کہ وہ کھڑا ہو کر دو پاؤں پر چلتا ہے، بقائے نسل کا معاملہ ہو یا اپنے تحفظ کا۔ سننے، دیکھنے، بولنے کا معاملہ ہو یا جنسی تعلق کا معاملہ ہو ان سب میں انسان اور دوسرے جانوروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ ہے نیکی اور بدی کی پہچان جانوروں میں نیکی، حرام اور حلال یا اچھا اور برا سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور انسان کو اسی تمیز کے ساتھ ساتھ نیکی اور بدی کے لیے میلان بھی رکھا گیا ہے۔ مقصد تحریر یہ ہے کہ انسان کو جس آزمائش کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ یہ کہ اپنے ارادے اور اختیار سے نیکی کا راستہ اختیار کرے اس سے یہ بھی بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی نہ ہوئی تو وہ جزا اور سزا کا بھی مستحق نہیں ہوگا۔ یہ بات درست ہے کہ اس پر نیکی اور بدی الہام کردی گئی ہے لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم نیکی کا پہلو خیر کا پہلو غالب ہونے دیں اور بہترین ساخت پر پیدا ہونے کا ثبوت دیں اور نوحؑ کی استقامت، جدوجہد اور صبر، موسیٰؑ کا کلیم اللہ ہو جانا، عیسیٰؑ کی خیر خواہی، یوسفؑ کی حیا اور پاک بازی اور محمدؐ کی صداقت وامانت، غمگساری ہونا، اخلاق، اسوہ، سیرت، کردار کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔

# دو انمول نعمتیں

"عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ والہ وسلم : نعمتانِ مغبون فیهما کثیر من الناس ،الصحة و الفراغ "۔ (صحیح بخاری ،کتاب الرقاق، باب ماجاء فی الرقاق)

"حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "دو نعمتیں ایسی ہیں جن سے اکثر لوگ غفلت میں رہتے ہیں :صحت اور فرصت"۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو پیدا کیا، اسے اپنا خلیفہ بنایا اور اسے لاتعداد نعمتوں سے نوازا اور اس پر بے شمار احسانات کیے۔ان کو شمار کرنے کے لیے اگر دنیا کے سارے درختوں کو قلم اور تمام سمندروں کو سیاہی بنا دیا جائے تب بھی ان عظیم نعمتوں کا بیان ناممکن ہے۔اللہ تعالیٰ کی ان بے شمار نعمتوں میں سے دو عظیم نعمتوں کا مندرجہ بالا حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔ ایک تندرستی ،دوسرے فرصت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دو نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سے اکثر لوگ غفلت میں رہتے ہیں اور ان سے جس قدر فائدہ اٹھانا چاہیے نہیں اٹھا پاتے۔اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان نعمتوں کے انسانی زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ان سے جہاں دنیاوی و اخروی فوائد حاصل ہوتے ہیں وہیں ان کی ناقدری کرنے سے عظیم خسارے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

## صحت

تندرستی ہزار نعمت ہے۔صحت و تندستی کے بے شمار فوائد ہیں۔عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے "چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں"۔آزادی کی قدر کا اس وقت تک احساس نہیں ہوتا، جب تک انسان قید کے مرحلے سے نہ گذرے۔ٹھیک اسی طرح صحت و تندرستی کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک انسان کسی بیماری کا شکار نہ ہو جائے۔

ہر انسان اپنے آپ کو روشنی ،دھوپ، تازہ ہوا، صاف پانی ،متوازن اور سادہ غذا ،صاف ستھرا لباس، مکان، جسم اور ماحول کی صفائی اور ہلکی پھلکی ورزش کے ذریعہ اپنے آپ کو صحت منداور طاقت ور بنا سکتا ہے۔آپؐ کا ارشاد ہے: "قوی مومن ضعیف مؤمن سے بہتر ہے"۔(حدیث) یہ کچھ سادہ سے اصول ہیں جن پر عمل کرنے میں کوئی بہت بڑی رکاوٹ آڑے نہیں آتی۔اس پر عمل کر کے انسان اپنے جسم و ذہن کو تندرست رکھ سکتا ہے۔بس تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے۔

## فرصت

دوسری بڑی نعمت ،جس کا اس حدیث میں تذکرہ کیا گیا ہے، وہ فرصت (فراغت) کے اوقات ہیں۔ہم اپنے عمل اور کوشش سے جو کچھ بھی حاصل کرنا چاہیں اس کی کام یابی کا راز وقت کے صحیح استعمال میں پوشیدہ ہے۔وقت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک سورہ کا نام ہی "العصر" (یعنی زمانہ یا وقت) رکھا ہے۔قرآن کے دوسرے مقامات پر بھی اس کی اہمیت کا تذکرہ ملتا ہے۔آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن انسان کی عمر اور خاص طور پر اس کی جوانی کے متعلق پوچھا جائے گا کہ یہ کیسے گزاری؟

ایک دوسرے مقام پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اس سے پہلے کہ مصروف ہو جاؤ فرصت کو غنیمت جانو" (حدیث)

موجودہ دور میں جہاں انسان بہت سے پیچیدہ مسائل سے گزر رہے ہیں ان میں ایک 'فرصت' (خالی وقت) کے اوقات ہیں ۔امیر، غریب، عالم، جاہل، ہر ایک کو یہ نعمت بآسانی میسر آتی ہے اور ہر ایک کے نزدیک اس کا جداگانہ مصرف ہے۔اسے وہ اپنے ذوق اور رجحان کے مطابق استعمال میں لاتے ہیں۔عصر حاضر میں زیادہ تر لوگوں کے فرصت کے لمحات سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس، Whatsapp,Facebook,Twitter, وغیرہ کے لیے وقف ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کثرت استعمال سے انسانی زندگی پر اس کے اتنے گہرے اثرات قائم ہو چکے ہیں کہ ان کے بغیر انسانی زندگی بالکل بے کیف اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے۔

فرصت کے لمحات حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ایک عظیم نعمت ہے۔فرصت کے قیمتی لمحات کو زیادہ سے زیادہ تعمیری کاموں میں صرف کرنا چاہیے، تاکہ ان کے ذریعہ ہم دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں کام یابی سے ہم کنار ہو سکیں۔

محمد اسعد فلاحی

صریر

# چاندسی بہو

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | چاندسی بہو |
| مصنف | : | سالک دھامپوری |
| صفحات | : | 160 |
| قیمت | : | -/107 روپئے |
| ناشر | : | جے پی ایس پبلشنگ ہاؤس، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 25 |
| رابطہ | : | 9910533470 / 9868966128 |
| مبصر | : | دلشاد حسین اصلاحی |

جس شخص نے سالک دھامپوری کو دیکھا نہ ہو اور صرف ان کی کتابوں ہی کے ذریعہ ان کو جانتا اور پہچانتا ہو اگر اس کی ملاقات ان سے ہو تو وہ ان کو اپنی خیالی شخصیت کے بالکل متضاد پائے گا۔ وہ ان کے چھوٹے سے قد اور ہلکے پھلکے جسم سے سمجھے گا کہ یہ سالک کی وہ شخصیت نہیں ہوسکتی جس کی کتابوں کو میں پڑھتا رہا ہوں۔ لیکن سامنے پا کر ان کی ذات سے منکر بھی نہیں ہوسکتا۔

سالک صاحب جسماً جتنے چھوٹے قد کے آدمی ہیں تخلیقی اور علمی لحاظ سے اس سے کہیں زیادہ قدآور ہیں۔ شاعر، صحافی، افسانہ نویس، ہندی مترجم کی حیثیت سے ان کی شخصیت بڑی معروف ہے۔ اگر وہ شہرت اور ناموری کا پیچھا کرتے تو شاید ہم جیسے عام آدمیوں کی دسترس سے باہر ہوتے۔ لیکن ان کی طبیعت نے قناعت اور گوشہ نشینی کو بہتر جانا۔ یہ باتیں تمہیداً میں نے اس لیے کہی ہیں کہ شہرت طلب، تعلّی پسند شخص بلندیوں کو پہنچ کر زمین سے کٹ جاتا ہے۔ لیکن ایک عمدہ تخلیق کار وہ ہے جو زمین سے جڑا رہے ہندوستانی سماج میں گھل مل جائے اور اپنے ماحول سے بے گانہ نہ ہو تو پھر اس کے فن میں عجیب سی شان پیدا ہو جائے گی۔

زیر نظر کتاب ''چاندسی بہو'' میں آپ یہی چیز پائیں گے۔ ان کا اسلوب نہایت سادہ سہل ہے۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ مضامین وہ ہیں جو قدم قدم پر آپ کو اپنے اردگرد کرداروں کی شکل میں چلتے پھرتے ملیں گے۔ لیکن یہ عام آدمی کی گرفت میں نہیں آتے بلکہ ایک قلم کار ان کو صفحۂ قرطاس پر سجا کر ہمارے روبرو کرتا ہے۔ تب قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ کردار تو میرے چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں اور یہی فن کا کمال ہے۔

سالک صاحب کی ہر کہانی کا تانا بانا سماج کی اصل تصویر آئینہ دار ہوتا ہے۔ وہ کہانی میں بڑی چابکدستی سے منظرکشی کرتے ہیں۔ منظرکشی اس کتاب کی تمام کہانیوں کا ابھرا ہوا پہلو ہے اور یہ منظر نگاری ہر کہانی کے ماحول اور کرداروں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ لہجہ، زبان اور کرداروں کے سماجی پس منظر اور نفسیات کو واضح کرتی ہے۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً:

''شام کا وقت تھا سورج کی کرنیں رفتہ رفتہ اپنی حرارت کھو رہی تھیں اور آسمان پر اڑتے ہوئے پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کی جانب

تیزی سے پرواز کررہے تھے۔موسم سرد تھا نہ گرم...... ماحول پر عجیب سا خوف طاری تھا۔ ہر شخص سہا ہوا تھا۔اس سہمے ہوئے ماحول میں رسول پور کی بڑی سڑک پر ایک خاموش جلوس جارہا تھا...... ہر شخص کی آنکھوں سے آنسوؤں کا امڈتا ہوا سیلاب تھا،لب بند تھے، دلوں پر ایک عظیم صدمے کا اثر تھا۔!!''

(اورلڑائی ختم ہوگئی،ص١٦)

''اٹھ کمبخت مارے، دن چڑھے تک سوتا رہتا ہے۔'' اماں نے جو چمٹا پھینک کر مارا تو سیدھا چھبو بھائی کے بستر پر جا کر پڑا۔ وہ توشکر کرو کہ ان کے اوپر پھٹی پرانی رضائی تھی۔ ورنہ ایک آدھ ٹانکا لگ ہی جانا تھا ان کے......اور اماں کی مغلظات کے امڈتے طوفان میں چھبو بھائی اچھل کر بستر سے اترے، جلدی جلدی بستر لپیٹا، جا کر کوٹھڑی میں رکھا۔ چار پائی صحن کی دیوار سے لگا کر کھڑی کی اور منھ دھونے غسل خانے میں جا گھسے۔''

(سوتیلا بیٹا،ص103)

''بارش ابھی ابھی ہوکر رکی تھی......سڑک پر چاروں طرف پانی بھرا ہوا تھا۔سڑک کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں بھی پانی بھر گیا تھا۔آتی جاتی گاڑیوں سے یہ پانی اڑ کر پیدل آنے جانے والوں پر چلا جاتا تھا۔بارش کے رکنے کے بعد آسمان بادلوں سے صاف ہوگیا تھا۔ بادل کسی آوارہ گرد کی طرح بگولوں کی شکل میں اڑ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ان کو کسی کام کی بڑی جلدی ہو۔...... ہوا میں خنکی آگئی تھی جو بڑی بھلی لگ رہی تھی ایک کنارے سے سورج بھی شرماتا ہوا اپنا چہرہ نکالتا ہوا آہستہ آہستہ دکھائی دے رہا تھا۔''

(مسلا ہوا پھول،ص122)

منظر نگاری کی ایسی مثالیں نرگس کی قربانی، ندامت کے آنسو، فسطائیت کا بت، پراسرار ہاتھ، بھکاری، اجنبی وغیرہ افسانوں میں بھی دکھائی دیں گی۔

اس کتاب میں 34 افسانے شامل ہیں اور ہر افسانہ اپنے جلو میں تعمیری، اصلاحی اور اخلاقی اقدار کی روشنی لیے ہوئے ہے۔ سالک صاحب اس روشنی سے سماج کو منور کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کام کو وہ پندو نصیحت اور وعظ کے ذریعے انجام نہیں دیتے بلکہ پورے طور سے فنی مہارت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہر تخلیق کو پڑھ کر قاری اپنے دل میں کسی غریب کی مدد، لاچار سے ہمدردی، استحصال کرنے والوں سے نفرت کے جذبات اپنے دل و دماغ میں موجزن پاتا ہے۔ جب کسی تخلیق کو پڑھ کر قاری کے دل میں اس کے حسبِ حال جذبات بیدار ہوجائیں تو یہ فن اور فنکار کا کمال تصور کیا جاتا ہے اور وہ اپنی تخلیق کے ذریعے اپنے مقصد کی ترسیل میں کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سالک دھامپوری اپنے مقصد کی ترسیل میں اپنے ہدف کو پانے میں کہیں ناکام نظر نہیں آتے۔اس کامیابی کا سہرا ان کی تین خوبیوں یا صفات کے سر جاتا ہے اول زبان و بیان پر دسترس، دوم اپنے سماج کے لیے خیر خواہی کے جذبات، سوم اور اہم خوبی یہ ہے کہ وہ ایک دردمند دل کے مالک ہیں۔ ان کا اسلوب بڑا سادا ہے، زبان ثقیل اور بوجھل الفاظ سے پاک ہے۔ چھوٹے چھوٹے سہل جملے اور موضوع کو چند صفحات میں سمیٹنے جیسی خوبیاں ان کے اندر موجود ہیں۔

سالک دھامپوری اپنی کتابوں پر بڑے بڑے ناقدین اور اردو کی جانی پہچانی شخصیات سے مقدمے اور تقاریظ لکھوانے کے چکر میں بالکل نہیں پڑتے یہ اپنے فن کے لیے ان کی خوداعتمادی کی دلیل

ہے۔اس کام کے لیے وہ ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے اپنے احباب ہی کو زحمت دیتے ہیں۔اس کتاب کا مقدمہ بھی انھوں نے اپنے ایک قریبی قدر شناس سے لکھوایا ہے، جو ادب میں بہت معروف تونہیں لیکن ایک بالغ النظر شاعر اور ان کے ہم وطن عبدالغفار صدیقی دانش نور پوری ہیں،جنھوں نے ان کے فن پر اپنی رائے یوں دی ہے:

''سالک دھامپوری کی کہانیاں کسی مافوق الفطرت مناظر کی سیر نہیں کراتیں...... بلکہ سچائی اور زمینی حقائق پر مبنی مناظر سے روبرو کراتی ہیں۔کہانیاں پڑھنے کے بعد ذرا سا آنکھیں بند کر کے جب ہم اپنے گھر، خاندان، آس پاس اور محلے پر نظر ڈالتے ہیں وہ کردار چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں۔''

مزید لکھتے ہیں کہ۔۔۔۔

''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد اور منشی پریم چند نے کہانیوں کے جس سلسلے کو جہاں چھوڑا تھا سالک دھامپوری نے اس سلسلے کو وہاں سے دراز کر دیا ہے۔کہانیاں اپنے دور کے الفاظ، محاورات و استعارات سے واقف ہی نہیں کراتیں بلکہ اس دور کے سماجی مسائل، نظامِ ترسیل، تہذیب و اقدار سے بھی آگاہ کرتی ہیں۔''
(مقدمہ،ص 9-10)

کتاب کی اہمیت و وقعت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی طباعت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، NCPUL نئی دہلی جیسے موقر ادارے نے مالی تعاون فراہم کیا ہے۔ کتاب خوبصورت دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ قیمت نہایت مناسب ہے۔ مصنف سے رابطہ کر کے کتاب حاصل کیجیے اور اپنے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا خود سامان کیجیے۔ نثری تخلیق کی مثالیں قاری کے لیے کچھ زیادہ تسکین کا باعث نہیں ہوتی اس لیے براہِ راست مطالعہ ہی قاری کے لیے زیادہ مفید ہوگا۔

## نظریہ ارتقاء کی علمی کمزوریاں مولانا مودودیؒ کی نظر میں

علمی اور عقلی حیثیت سے اس نظریہ میں جو کمزوریاں ہیں ان سے قطع تعلق نظر کر کے اگر دیکھا جائے کہ فلسفہ اور اخلاق اور علومِ تمدن و اجتماع میں داخل ہو کر اس ظالم تخیل نے انسان کو برباد کرنے کے لیے کیسے شدید فتنے برپا کیے ہیں، تو شاید کسی صاحبِ بصیرت آدمی کو یہ ماننے میں ذرہ برابر تامل نہ ہوگا کہ موجودہ دور میں جن نظریات نے انسان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کی ہے، یہ ڈارونیت اُن سب کی سرتاج ہے۔اس نے انسان کو یقین دلایا ہے کہ تو جانوروں میں سے بس ایک جانور ہے۔اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آدم کی اولاد آج پورے اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی کے ہر پہلو میں حیوانیت کا برتاؤ کر رہی ہے اور اسی کا یہ اثر ہے کہ انسان اپنی زندگی کے قوانین اور اصول کسی برتر ماخذِ ہدایت میں تلاش کرنے کے بجائے حیوانات کی زندگی میں تلاش کر رہا ہے۔ پھر یہ ڈارون ہی کا نظریہ ہے جس نے انسان کے سامنے پورے نظامِ کائنات کو ایک رزم گاہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس کو بتایا ہے کہ نزاع اور جنگ اور کشمکش ہی اصل تقاضائے فطرت ہے۔اس کشمکش میں جو زور آور ہے وہی زندہ اور کامیاب ہے اور وہی صالح اور برحق ہے۔ بخلاف اس کے جو کمزور ہے وہی غیر صالح ہے اور اس کا مٹنا اور فنا ہو جانا قوانینِ فطرت کا ایک ایسا نتیجہ ہے جس کو برحق ہونا ہی چاہیے۔آج یہ اسی طرزِ فکر کی برکات ہیں کہ انسانی افراد سے لے کر طبقات، اقوام اور ممالک تک سب کے سب دنیا کو حقیقت میں ایک رزم گاہ بنائے ہوئے ہیں اور فطرت کا تقاضا انھوں نے یہی سمجھا ہے کہ جو طاقتور ہے وہ کمزور کو فنا کر دے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
(بحوالہ تفہیمات، حصہ دوم)